پاکستان کے ایک مصنف ادیم نقوی صاحب کی کتاب سے اقتباس پیش ہے۔

"انجمن اثنا عشری یو پی لاہور کا سالانہ جلسہ ۱۹۴۲ء میں لاہور میں منعقد ہوا۔ اس میں تقریر کرنے کے لیے بعض علمائے لکھنؤ بھی مدعو تھے۔ ان کے من جملہ ایک حضرت علامہ ابن حسن نونہروی (طاب ثراہ) بھی تھے۔ بندۂ حقیر ان کی زیارت سے مشرف ہونے کی غرض سے حاضر خدمت ہوا۔ بیٹھا ہی تھا کہ چند حضرات اور بھی حاضر خدمت ہوئے۔ ان میں سے ایک صاحب نے حضرت علامہ سے سوال کیا

سائل: قبلہ وکعبہ یہ توحید کی تعلیم جو آپ حضرات ہمیں تعلیم فرماتے ہیں کہ خدا کی آٹھ صفات ثبوتیہ اور آٹھ صفات سلبیہ ہیں۔ کیا اہل بیت علیہم السّلام کی تعلیم کردہ ہیں؟

علامہ صاحب: نہیں۔

سائل: پھر تعلیم اہل بیت علیہم السّلام کہاں ہے اور کیا ہے؟ وہ ہمارے سامنے کیوں نہیں آتی؟

علامہ صاحب: لوگوں میں اس کے سننے کی اہلیت نہیں۔

سائل: قبلہ وکعبہ جب ہمیں تعلیم اہل بیت سننے کی بھی اہلیت نہیں تو پھر ہم شیعہ کس کے ہیں۔ اہل بیت کے شیعہ تو ہو نہیں سکتے۔

علامہ صاحب: کیا کیا جائے جب لوگوں میں اس کے سمجھنے کی اہلیت نہیں ہے تو کیسے بیان کیا جا سکتا ہے۔

سائل : تدوین کتب کو نو سو ۹۰۰ برس گزر گئے جب شیعوں میں نو سو برس میں بھی اہلیت پیدا نہ ہو سکی تو آخر وہ کب پیدا ہو سکے گی۔ پھر یہ کہ مروجہ شیعیت کیسی ہے ؟

علامہ صاحب : میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتا کہ مجبوری ہے۔ کسی کی اہلیت سے زیادہ بار اس پر نہیں ڈالا جا سکتا۔

بس اس پر گفتگو ختم ہو گئی اور وہ حضرات اٹھ کر چلے گئے۔ اس واقعہ کے بعد ایک خلجان سا پیدا ہو گیا۔ اسی زمانہ میں کتاب "اظہار حقیقت" رد کتاب شہید انسانیت جو لکھنؤ سے شائع ہوئی تھی نظر سے گزری۔ اس میں چند احادیث اس مضمون کی درج ہیں جن کا لب لباب یہ ہے کہ "حضرت حجت کے ظہور کے وقت انتظار کرنے والے ہی دشمن ہو جائیں گے"۔ ناظرین تو اس کا سبب خود ہی سمجھ سکتے ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ اہل بیت طاہرین کی واحد نشانی بقیۃ اللہ تو اپنے آباء طاہرین کی تعلیم لے کر ہی آئے گا جس کی سننے کی بھی شیعوں میں اہلیت نہیں (بقول علامہ صاحب) پھر جب وہ تعلیم بے حجاب سامنے آئے گی تو اس کے دشمن کیوں نہ ہو جائیں گے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ وہ تعلیم اہل بیت ع جو کتابوں میں دفن ہے اور افراد قوم شیعہ کے سامنے نہیں آئی اب پیش کر دی جائے "۔

(ماخوذ از "جاہلیت کی موت ص۵ تا ص۱۷)

مندرجہ بالا عبارت سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ہم جھوٹ کے اتنے عادی ہو چکے ہیں کہ اب اگر "سچوں" کی کوئی بات ہمارے سامنے پیش کی جائے تو ہم برداشت نہیں کر پائیں گے اور جھگڑا فساد کرنے لگیں گے۔

ایک عالم دین نے مجھ سے فرمایا تھا "تقیہ کا حکم جو اللہ نے دیا ہے وہ اپنی ہی قوم سے کرنے کے لیے ہے"۔

اس طرح جب ہم علوم اہل بیت سے ناآشنا رہیں گے تو کیوں کر ان کی پیروی کر کے "کُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ (سچوں کے ساتھ ہو جاؤ) کے حکم الٰہی کی تعمیل کر سکتے ہیں۔

ہمارا عقیدہ اور ایمان ہے کہ حکم الٰہی اور تعلیمات رسول اکرمؐ کا کامل نمونہ حضرات اہل بیت علیہم السّلام ہیں۔ لیکن ساتھ ہی ہمارا یہ مشاہدہ ہے کہ آج "فضائل اہل بیتؑ" اور "معجزات معصومین" کی دہائی دینے والوں کی اکثریت ان افراد پر مبنی ہے جو اسی طرح کے منافق ہیں جیسے وہ لوگ تھے جو ایک جانب تو کلمۂ توحید اور اقرار رسالت کر رہے تھے مگر ساتھ ہی نواسۂ رسول کو بے جرم و خطا قتل کر رہے تھے۔

کیا آپ نے کبھی ایسی تقریر سنی ہے جس میں مقرر نے کہا ہو کہ منبر صرف فضائل علیؑ بیان کرنے کے لیے ہے۔ یہ نماز و روزہ و دیگر احکام شرعیہ کے بیان کرنے کی جگہ نہیں ہے۔ اگر آپ نے کبھی ایسی تقریر سنی ہو تو آپ سمجھ لیں کہ کسی منافق کا بیان آپ نے سنا۔

کیوں؟ اس لیے کہ وہ زبان سے تو حضرت علی کا نام لے رہا ہے

مگر اس نے حضرت علیؑ کی سیرت کا مطالعہ نہیں کیا۔ اگر اس نے یہ دیکھا ہوتا کہ حضرت علیؑ نے منبر سے کن موضوعات پر تقریریں کی ہیں تو وہ کبھی اس طرح کی بات نہیں کہتا۔

کیا آپ نے کبھی ایسی تقریر سنی ہے جس میں مقرر نے کہا ہو کہ فلاں شخص نے جناب فضہ کو نجس کہہ دیا، فلاں شخص نے کہہ دیا کہ اماباڑوں میں حالتِ نجاست میں جایا جا سکتا ہے، لہذا اس نے اہل بیت علیہم السلام کی توہین کر دی۔ تو آپ یقین رکھیں کہ آپ نے کسی منافق کی بات سنی ہے۔

کیوں؟ اس لیے کہ وہ برسرِ عام جھوٹ بول رہا ہے۔ وہ لوگوں کو مشتعل کر رہا ہے۔ اگر وہ منافق نہ ہوتا تو بجائے لوگوں کے ذہنوں میں زہر گھولنے کے، بڑے امام باڑے، چھوٹے امام باڑے اور شاہ نجف میں داخل ہونے والے، وہاں کے تعزیوں، علموں اور منبروں کو چھونے والے افراد کے بارے میں بھی کچھ کہتا۔ کیا ان اماباڑوں میں جانے والے سب مومن اور باطہارت ہوتے ہیں؟ اگر لوگوں کو اشتعال دلانے والا مومن ہوتا تو افرادِ ملت کو سمجھاتا کہ صرف تحریر کسی شخص کے عقائد کو تولنے کا پیمانہ نہیں بن سکتی۔ وہ سمجھاتا کہ وہ اور ہیں جنھوں نے حسبنا کتاب اللہ کا نعرہ دیا تھا ہم تو وہ ہیں جو اللہ کی کتاب کو بھی کافی نہیں مانتے اور مزید تشریح کے طالب رہتے ہیں۔ لہذا جب معبود کی کتاب کافی نہیں ہے تو بندے کی تحریر کیسے کافی ہو سکتی ہے۔

اگر آپ نے کوئی ایسی تقریر سنی ہے جس میں کسی عالم دین پر لعنت

بھیجی گئی ہو تو آپ سمجھ لیں کہ آپ نے کسی مجلسِ عزا یا محفل فضائل میں شرکت نہیں کی بلکہ آپ منافقوں کی کسی چنڈال چوکڑی میں پھنس گئے تھے۔ کیوں؟ اس لیے کہ اگر آپ صاحبانِ ایمان کی بزم میں بیٹھے ہوتے تو وہ کسی عالم دین پر لعنت کرنے کے بجائے یہ کہتا کہ فلاں عالم دین سے اس معاملے میں سہو ہو گیا ہے۔ آپ اس موضوع پر فلاں فلاں علماء کی تحریریں بھی ملاحظہ فرمالیں۔

کیا اپنی ہی قوم کے افراد کو دشمنِ اہل بیت کہنے والے افراد کے کرداروں کو آپ نے تولا ہے؟ ان میں آپ کو ایسے لوگ ملیں گے جو کھلم کھلا اوقاف کی جائدادیں لوٹ رہے ہیں یا ان کے قریبی ساتھیوں اور دوستوں میں اوقاف کے لٹیرے شامل ہیں۔ کیا اوقاف کی جائدادیں لوٹنے والے محب اہل بیتؑ ہیں؟ اگر نہیں تو ان کے بارے میں یہ لوگ خاموش کیوں ہیں؟

ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم حق و باطل کی پرکھ کر کے حق کو قبول کریں اگر ہم موجودہ قومی مسائل میں حق کی شناخت نہیں کر سکتے ہیں تو ہمارا یہ کہنا کہ ہم اگر ۶۱ھ میں کربلا میں ہوتے تو امام حسینؑ کا ساتھ دیتے، کیا معنی رکھتا ہے؟ جب ہم یہاں لوگوں کی چرب زبانیوں میں پھنسے جا رہے ہیں تو وہاں کیا حال ہوتا، وہاں ہم کدھر ہوتے؟ یہ وہ سوال ہے جس پر ہم کو اور آپ کو خوب غور کرنا چاہیے۔

کُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ "سچوں کے ساتھ ہو جاؤ"۔

یہ ایک انقلابی پیغام اور حکم الٰہی ہے جو سورۂ توبہ کی ۱۱۹ ویں آیت میں دیا گیا ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ کا لطف و کرم ہے کہ اس نے محض حکم ہی نہیں دیا ہے بلکہ اس نے طریقۂ کار بھی واضح کر دیا ہے کہ جس پر عمل پیرا ہو کر انسان نیکی پا کر سچوں اور متقین کی جماعت میں سے ہو جائے۔ چنانچہ سورۂ بقرہ کی ۱۷۷ ویں آیت ہمارے سامنے ایک جامع عنوان سے تعارف کراتی ہے۔ ارشاد رب العزت ہے:

لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَ الْكِتٰبِ وَالنَّبِیّٖنَ ج وَ اٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِی الْقُرْبٰى وَ الْیَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ وَالسَّآئِلِیْنَ وَ فِی الرِّقَابِ ج وَ اَقَامَ الصَّلٰوةَ وَ اٰتَى الزَّكٰوةَ ج وَ الْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ج وَالصّٰبِرِیْنَ فِی الْبَاْسَآءِ وَ الضَّرَّآءِ وَحِیْنَ الْبَاْسِ ط اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا ط وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۝

"نیکی یہ نہیں ہے کہ تم اپنا منھ پورب یا پچھم کی طرف کر لو، بلکہ نیکی اس کی ہے جو ایمان لائے اللہ پر، روز آخرت پر، ملائکہ پر، کتاب پر اور انبیاء پر اور مال کو اللہ کی محبت میں خرچ کرے،

قرابت داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں، سائلوں پر اور گردنوں کو چھڑانے میں اور نمازوں کو قائم کرے، زکوٰۃ کو ادا کرے اور جب کوئی عہد کرے تو اس کو پورا کرے اور صبر کرنے والے ہوں تنگ دستی، بیماری اور قتال میں۔ یہی لوگ وہ ہیں جو (دعوائے ایمان میں) سچے ہیں اور یہی لوگ متقی ہیں۔"

اس آیۂ کریمہ سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ نیکی "عقیدہ وعمل" کی ہم آہنگی سے پیدا ہوتی ہے۔ جن کا ایمان درست ہے تو وہ محض زبان وحلق تک محدود نہیں رہتا بلکہ اس کا اظہار پوری طرزِ زندگی سے ہوتا ہے۔ جن لوگوں کا عمل اُن کے عقیدہ کی گواہی دے تو بس وہی سچے ہیں۔

اس مختصر تمہید کے بعد میں آپ کے سامنے دو تصورات پیش کر رہا ہوں۔ آپ فیصلہ کریں کہ حق سے کون زیادہ قریب ہے۔

ایک تصور یہ ہے کہ شیعوں کی زندگی کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ ہم حضرات اہل بیت علیہم السلام کی خوشی میں خوش اور غم میں غمگین رہیں جب ان کے فضائل بیان ہوں تو واہ واہ، سبحان اللہ کریں اور جب ان پر ڈھائے گئے مظالم کا تذکرہ ہو تو گریہ کریں۔ اہل بیتؑ کے تذکرہ کے ساتھ نماز، روزہ و دیگر عبادات کا ذکر نہ کیا جائے۔ منبر سے جو بھی اُن کے معجزات بیان ہوں اُس کو فوراً مان لے اور یہ جاننے کی ہرگز کوشش نہ کرے کہ جو کچھ ذاکر نے بیان کیا ہے وہ کس کتاب میں درج ہے۔ ایسی

بات کی جستجو کرنے والا شیعہ نہیں ہوتا بلکہ دشمنِ اہل بیت ہوتا ہے۔ ذکرِ اہل بیتؑ کے ساتھ اصلاح قوم اور تبلیغ دین کی بات کرنے والا محبِ اہل بیت نہ ہو کر دشمن اہل بیت ہوتا ہے۔

دوسرا تصور یہ ہے کہ شیعہ ہونے کے معنی یہ ہیں کہ انسان اہلبیتؑ کی پیروی و تاسی کرتا ہو، حتی الامکان ان کا اتباع کرتا ہو۔ اس کے نزدیک ذکر اہل بیتؑ محض واہ واہ کرنے یا گریہ کرنے ہی کا ذریعہ نہ ہو بلکہ وہ ان کے فضائل کی روشنی میں حق کی راہ تلاش کرے اور ان کے مصائب کے تذکروں سے یہ درس حاصل کرے کہ حق کی راہ میں مشکلات کے باوجود کس طرح ثابت قدم رہا جاتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ حضرت علی علیہ السلام کے نزدیک خلافت و حکومت کی وقعت بھیڑ کی ناک سے بہنے والے مادہ سے بھی کمتر تھی۔ جب کہ دین کی وقعت یہ تھی کہ اس کی حفاظت و سربلندی کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی اور جان بھی قربان کر دی۔ وہ تعجب کرتا ہے کہ کیوں کر کمتر چیز کا تذکرہ تو منبر سے ہو سکتا ہے لیکن برتر چیز کا تذکرہ نہیں ہو سکتا۔ وہ حتی الامکان سیرت معصومین کا اتباع کرتا ہے اور دوسروں تک بھی ارشادات معصومین اور سیرت معصومین کی جھلکیاں پیش کرتا ہے۔

ہم لوگوں کے نزدیک یہ دوسرا تصور جس کے مطابق محبت کا اظہار اطاعت الٰہی کی صورت میں رونما ہوتا ہے حق ہے۔

آپ اپنی جگہ پر غور کیجیے کہ حق کیا ہے اور غور کرتے وقت آیاتِ قرآنی اور کلام معصوم کو پیش نظر رکھیں تو انشاء اللہ جلد ہی حقیقت واضح ہو جائے گی۔

"علاّمہ" یا "ابوجہل"

ضمیر اختر نقوی نام کے ایک ذاکر آج کل پاکستان سے لکھنؤ آئے ہوئے ہیں۔ وزیر گنج کے ایک وقف خور نے اُن کو "ضیغم پاکستان" کے بھاری بھرکم لقب سے نوازا ہے جب کہ خود ضمیر اختر صاحب کو کراچی کے مومنین "زنانہ ذاکر" کہتے ہیں۔ کون صحیح ہے اس کا فیصلہ آپ خود ان علامہ صاحب کا حُلیہ دیکھ کر کر سکتے ہیں۔ خیر ہمیں کسی کی صورت شکل سے کیا لینا دینا۔ جیسی صورت ہے اللہ نے بنائی ہے اور اپنی حکمت و مصلحت کو وہی جانتا ہے۔

ہم جو بات قارئین پیامِ نو اور لکھنؤ کے مومنین کی خدمت میں پیش کرنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ ماہِ صفر ۱۴۱۰ھ میں لکھنؤ سے مولانا علی عباس طباطبائی کراچی تشریف لے گئے تھے۔ وہاں ان کی ملاقات ضمیر اختر نقوی صاحب سے ہوئی تھی۔ مولانا علی عباس صاحب نے ان سے دورانِ گفتگو کہا کہ آج کل ہمارے یہاں لکھنؤ میں اس روایت پر بڑی گرماگرمی ہے کہ حضرت علی علیہ السلام گھوڑے پر بیٹھتے وقت ایک رکاب سے دوسری رکاب کے درمیان پورے قرآن کی تلاوت

یہ مضمون پیام نو مورخہ یکم دسمبر ۱۹۸۹ء کی اشاعت میں شائع کیا جاچکا ہے۔

فرما لیتے تھے۔ آپ کا اس روایت کے بارے میں کیا خیال ہے؟ ضمیر اختر نقوی صاحب نے کہا کہ میں اپنی مجلس میں اس روایت پر روشنی ڈالوں گا۔ جب ضمیر اختر صاحب نے مجلس پڑھی تو اس میں نہ تو اس روایت کا کوئی حوالہ دیا نہ ہی راویوں کا نام بتایا، نہ ہی علم رجال کے مطابق راویوں کی صحت پر کوئی روشنی ڈالی اور نہ ہی کوئی علمی استدلال پیش کیا۔ مجلس کے بعد پھر مولانا علی عباس صاحب نے ضمیر اختر صاحب سے گفتگو کی اور روایت کا حوالہ پوچھا۔ انھوں نے فرمایا کہ گھر میں کتاب رکھی ہے۔ مولانا علی عباس صاحب ضمیر اختر صاحب کے گھر تک گئے۔ ضمیر اختر صاحب نے روایت کی سند تلاش کرنے کی بہت کوشش کی مگر بات عبدالرحمٰن جامی سے آگے نہ بڑھ پائی۔ مولانا علی عباس صاحب نے ضمیر اختر صاحب سے کہا کہ آپ اس موضوع پر طالب جوہری صاحب و دیگر علماء سے گفتگو فرمالیں۔ تاکہ جب آپ ماہ نومبر میں لکھنؤ تشریف لائیں تو کوئی تشفی بخش بات کہہ سکیں۔

چونکہ مولانا علی عباس صاحب سے مجھے اس گفتگو کی اطلاع مل چکی تھی لہٰذا میں بھی علاّمہ صاحب کی آمد کا مشتاق تھا۔ مجھے یہ توقع تھی کہ ضمیر اختر صاحب کوئی علمی تحقیق پیش کریں گے۔ مگر بدقسمتی سے میری توقعات کے برعکس ضمیر اختر صاحب نے انتہائی جہالت اور حماقت کا ثبوت دیا۔ جن اختلافی مسائل پر لکھنؤ کے منبروں سے چرب زبانیوں کے جوہر دکھا کر یہاں کے ذاکرین تھک چکے تھے، اُن ہی اختلافی مسائل

میں " علامہ صاحب " آنکھ بند کر کے کود پڑے ۔ ان مسائل میں قضیہ شہید انسانیت، عَلِیٌّ وَلِیُّ اللّٰہِ، علم و تعزیہ کا حالت حیض یا جنابت میں مس کرنا، گھوڑے پر تلاوت، جناب فضہ، جناب سید سجاد کی بیماری، جناب سیدہ کی مجالس میں آمد وغیرہ سب ہی شامل ہے۔

میں نے ان کے کچھ بیانات کے ٹیپ سنے ہیں۔ ضمیر اختر صاحب نے درگاہ کی مجالس میں اس بات کا اعلان کیا تھا کہ اگر کسی کو کوئی سوال کرنا ہو تو میں ۲۰ر نومبر والی مجلس میں جواب دوں گا۔ اتمام حجت کے طور پر بعض احباب کی فرمائش پر میں نے ۲۰ر نومبر ۱۹۸۹ء کو تین سوالا لکھ کر دیے تاکہ یہ سوالات علامہ صاحب تک پہنچا دیے جائیں۔ ۲۰ر نومبر کی مجلس میں علامہ صاحب نے مومنین کے سامنے سوالات پڑھنے کی زحمت گوارا نہیں فرمائی، بس فرما دیا کہ فلاں فلاں موضوعات پر سوال آئے ہیں اور میں اپنی تقاریر میں پہلے ہی ان پر روشنی ڈال چکا ہوں۔ پھر پتہ نہیں کیوں، اگلے دن کی مجلس (۲۱ر نومبر) کو پھر انھوں نے سوالات پڑھے مگر کچھ کاٹ چھانٹ کر لیکن جواب نہیں دیے۔ قارئین کرام کی خدمت میں تینوں سوالات پیش ہیں۔

سوال ۱: جناب والا شہر لکھنؤ میں ایک لمبے عرصہ سے اس روایت پر مومنین میں کافی اختلاف پایا جاتا ہے کہ حضرت علی علیہ السلام گھوڑے پر سوار ہوتے وقت ایک رکاب سے دوسری رکاب کے درمیان پیر رکھتے وقت پورے قرآن کی تلاوت فرما لیتے تھے۔ برائے

مہربانی آپ یہ فرمائیں کہ کس شیعہ عالم نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور یہ کہ قرآن و احادیث کی روشنی میں آدابِ تلاوت کی خلاف ورزی تو اس روایت سے ثابت نہیں ہوتی؟ اگر یہ روایت کسی شیعہ عالم کی کتاب میں آپ کی نظر سے نہ گزری ہو تو یہ بھی بیان فرمادیں۔

سوال ۲ جناب والا آپ نے اپنی پہلی تقریر میں خانوادۂ اہلبیتؑ میں صرف تین بیماریوں کا تذکرہ کیا ہے۔ دردِ سر، تپ اور آشوب چشم۔ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ یہ تینوں بیماریاں جدید طب میں بیماری نہ قرار پاکر صحت کی علامت ہیں۔ پھر ہم جناب سیّد سجاد کو بیمار کہنے پر کیوں مصر ہیں؟ آپ کی تحقیق کے مطابق جناب سیّد سجاد کو کربلا میں کون سی بیماری تھی؟ برائے مہربانی ضروری حوالہ دینے کی زحمت گوارا فرمائیں۔ میری نظر سے شیخ مفید علیہ الرحمہ کی کتاب الارشاد گزری ہے جس میں سیّد سجاد علیہ السلام کی بیماری "پیچش" لکھی ہے۔ برائے مہربانی ان علماء کی کتابوں کا حوالہ دیں جنھوں نے شیخ مفید سے اختلاف کیا ہے۔

سوال ۳ جناب والا ایک اور مسئلہ جس میں مومنین لکھنؤ میں کافی ہنگامہ آرائی رہی ہے وہ یہ ہے کہ آقائے خوئیؒ نے حالت نجاست میں امام باڑے میں جانے اور علم و تعزیہ چھونے کے بارے میں فتویٰ دیا تھا کہ اس میں کوئی ممانعت نہیں ہے۔ اس فتوے کے بعد تنظیم المکاتب کے ذمہ داران (خاص طور پر مولانا غلام عسکری صاحب) کے خلاف کافی مجلسیں پڑھی گئیں۔ حال ہی میں ہفت روزہ اخبار

"پیامِ نو" میں یہ لکھا گیا کہ جب جناب سیدہ کا گھر امام بارڑے سے زیادہ محترم ہے اور جب جناب فضہؓ جناب سیدہ کے گھر میں رہتی تھیں اور اپنے مخصوص ایام بھی وہیں گزارتی تھیں تو پھر یہ فالتو بحث کیسی؟ برائے مہربانی آپ یہ بتانے کی زحمت فرمائیں کہ کیا اس جملہ سے جناب فضہ کے متعلق کوئی خلاف واقعہ بات منسوب کی گئی ہے؟ اگر ایسا ہے تو برائے مہربانی وضاحت فرمائیں اور ضروری کتابوں کا حوالہ دیں۔

قارئین کرام خود ملاحظہ فرمائیں کہ جب ان موضوعات پر علامہ صاحب نے یک طرفہ طور پر تقریریں کیں تو کیا ان کی یہ ذمہ داری نہیں بنتی تھی کہ وہ عوام کے سامنے حق بیانی سے کام لیتے۔ علماء کی تحریروں کے حوالے سے گفتگو کرتے۔ ورنہ دوسری صورت میں لمبے چوڑے القاب نہ لگاتے۔

اصل خطرہ

گذشتہ مضمون میں ہم نے "علامہ یا ابوجہل" کے عنوان سے پاکستان کے ایک ذاکر کی غلط روش کے بارے میں عرض کیا تھا۔ اسی ضمن میں ان تین سوالات کا تذکرہ بھی کیا تھا جن کا تعلق پیام نو کی تحریروں سے ہے۔

حقیقت حال یہ ہے کہ کیا پاکستان اور کیا ہندوستان، دونوں ہی جگہ بعض شر پسند عناصر نا اہلوں کو لمبے چوڑے القاب عطا کر کے ان کے قد کو بڑھانے کی کوشش کرتے ہیں اور یہ لوگ جھوٹے القاب کے نشے میں اوقات سے باہر ہو کر اوچھی حرکتیں کرنے لگتے ہیں۔

ضمیر اختر نقوی صاحب کو جب دو تین ماہ قبل مولانا علی عباس صاحب طباطبائی کے ذریعہ گھوڑے پر ختم قرآن والی روایت کے بارے میں ہمارا موقف معلوم ہو چکا تھا تو ان کے لیے بہتر یہی ہوتا کہ اس روایت کا حوالہ اور اس کی صحت پر ایک مقالہ تحریر فرما دیتے جس کو پیام نو و دیگر قومی اخبار و رسائل میں شائع کر دیا جاتا۔ مگر انھوں نے بجائے علمی طریقہ اختیار کرنے کے جہالت کو اپنا لیا۔

میں واضح کر دوں کہ گھوڑے پر سوار ہوتے وقت حضرت علیؑ کے

یہ مضمون پیام نو مورخہ ۸ر دسمبر ۱۹۸۹ء کی اشاعت میں شائع کیا جا چکا ہے۔

ختم قرآن کرنے والی روایت کا تعلق شیعہ عقائد سے نہیں ہے اور نہ ہی شیعہ علماء نے اس کو نقل کیا ہے۔ یہ بات ضمیر اختر صاحب بخوبی جانتے ہیں مگر چند جاہلوں کی واہ واہی حاصل کرنے کی خاطر انھوں نے حق کو چھپایا ہے۔

اگر کوئی شخص یہ عقیدہ رکھتا ہو کہ حضرت عیسٰی خدا کے بیٹے ہیں اور آپ اس کو سمجھائیے کہ جناب عیسٰی خدا کے نیک اور مقرب بندے ہیں نہ کہ اس کے بیٹے۔ تو اب وہ اگر یہ کہے کہ آپ حرامی ہیں، اگر آپ حلالی ہوتے تو جناب عیسٰی کی فضیلت سے انکار نہ کرتے۔ یا یہ کہ وہ کہے کہ آپ کی ماں بدکارہ تھی۔ اگر اس نے حلال سے آپ کو پیدا کیا ہوتا تو آپ اللہ کی قدرت سے انکار نہ کرتے۔ بھلا جو خدا زمین، چاند اور آسمان پیدا کر سکتا ہے وہ اپنے لیے ایک بیٹا نہیں بنا سکتا؟ تو ایسے شخص کے بارے میں آپ کیا فرمائیں گے؟

کسی مذہب کے بنیادی عقائد سے مراد وہ نظریات ہوتے ہیں جن کے حق و باطل ہونے پر خود اس مذہب کے حق یا باطل ہونے کا انحصار ہوتا ہے۔ لہٰذا ہر زندہ مذہب کو اپنے بنیادی عقائد کو صحیح ثابت کرنے کے لیے دلائل بھی مہیا کرنے ہوتے ہیں۔ ورنہ وہ مذہب چند افراد یا کسی مخصوص جماعت کا مذہب تو ہو سکتا ہے مگر پوری نوع انسانی کا دین نہیں ہو سکتا۔

یہ ہماری قوم کی بدنصیبی رہی ہے کہ منبروں سے غیر ضروری باتوں کو بنیادی عقائد کا درجہ دے کر عام انسانوں کے ذہنوں میں زہر گھولا

گیا ہے۔ بجائے اس کے کہ عام شیعہ کو یہ بتایا جاتا کہ کس طرح وہ حق و باطل کی تمیز کر سکے، کس طرح روایتوں کو پرکھ سکے، محض سنی سنائی باتوں کو اصول دین سے بھی بڑھا دیا گیا۔ چنانچہ جو شخص نماز نہ پڑھے، واجبات کو ادا نہ کرے وہ تو شیعہ ہو سکتا ہے، مگر جو ان بے ایمانوں کی بیان کردہ جھوٹی روایتوں کو پرکھنا چاہے، سند اور حوالے طلب کرے تو وہ شیعہ ہونا تو درکنار دشمنِ اہل بیتؑ وہابی اور ولد الحرام قرار دیا جاتا ہے۔ کیا یہی وہ دین تھا جس کی تبلیغ رسول اکرمؐ نے کی، جس کی حفاظت کے لیے ائمۂ طاہرین علیہم السّلام نے اپنی زندگیوں کو وقف کر دیا؟

کیا وجہ ہے کہ ہم سچوں کی محبت کا دم بھرتے ہیں مگر جھوٹ، بدی، غیبت اور بہتان تراشی ہماری قومی زندگی کے رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے ہے؟ کیا وجہ ہے کہ ہم جناب میثم تمار اور ابو ذر غفاری کی حق بیانی کا تذکرہ کرتے ہیں مگر لوگوں کی ہمت خود حق بات کہنے کی نہیں پڑتی؟ کیا وجہ ہے کہ ہم اصحاب حسینی کے اتحاد و یگانگت کا تذکرہ کرتے ہیں مگر خود ہماری قوم کا شیرازہ منتشر ہے۔

اس کی صرف یہی وجہ ہے کہ ہم اہل بیت علیہم السّلام کا تذکرہ محض فلمی انداز میں کرتے ہیں۔ ہم صرف اپنی تفریح طبع کے لیے مجالس و محافل کا انعقاد کرتے ہیں۔ ہمارے ذہن میں ہلکا سا بھی یہ تصور نہیں ہوتا کہ رسولؐ و آل رسولؐ کسی دین کے پیرو اور داعی تھے۔ بغیر اس دین کو سمجھے ہوئے اس کے اوامر و نواہی پر کاربند ہوئے ہم اہل بیت علیہم السّلام

کا مقصد معاشرہ کی سمت بدلنا ہے۔ کفر و نفاق کی غلاظتوں سے نکال کر ایمان اور تقویٰ کی راہ دکھانا ہے۔ لہٰذا عقیدوں کا ٹکراؤ بھی ہوگا اور شخصیتوں کا ٹکراؤ بھی ہوگا۔ ہم اللہ ہی پر بھروسہ کرتے ہیں، اسی سے مدد طلب کرتے ہیں اور دین کی راہ میں جان دینا اپنی سعادت و خوش بختی سمجھتے ہیں۔ ہمیں قوم کے روشن مستقبل پر پورا بھروسہ ہے اور ہمیں یقین کامل ہے کہ وہ وقت دور نہیں ہے کہ جب لوگ نہ صرف یہ کہ حق سے واقف ہو جائیں گے بلکہ ان کو حق کی کسوٹی پر شخصیتوں کو پرکھنا بھی آجائے گا۔

اللہ سے دعا ہے کہ وہ ہماری اس سعی کو قبول فرمائے، میری اور میرے ساتھیوں کی توفیقات میں اضافہ فرمائے، ہماری خطاؤں سے درگذر فرمائے ہمیں شرح صدر عطا فرمائے تاکہ ہم اُس کی اطاعت و عبادت بہتر طریقہ پر انجام دے سکیں (آمین)۔

نئی نسل کی فکری تربیت

(۱۸، ۱۹ اور ۲۰ جنوری ۱۹۹۰ء کو جامعۃ الثقلین (دہلی) کے زیر اہتمام غالب اکیڈمی، نئی دہلی میں "امام امت آیۃ اللہ خمینی بین الاقوامی سمینار" کا انعقاد کیا گیا۔ اس سمینار میں "نئی نسل کی فکری گہرائیوں میں اسلامی اقدار کی تلاش و ترسیخ" کے عنوان سے ۱۹ جنوری ۱۹۹۰ء کو جو مقالہ میں نے پیش کیا اس کا آخری جز قارئین پیام نو کی خدمت میں پیش ہے۔)

میں جب موجودہ صورت حال کا تجزیہ کرتا ہوں تو یہ پاتا ہوں کہ ہماری پرانی نسل نے نئی نسل کو جو دین کا تصور منتقل کیا ہے وہ، وہ شعوری ایمان والا دین نہیں ہے جس کا تقاضہ قرآن کریم کرتا ہے۔ جہاں تک اس احساس کا سوال ہے کہ ہم مسلمان ہیں یا یہ کہ ہمارے مذہب کا نام اسلام ہے تو اس کے لیے قرآن، حدیث یا کائنات کی نشانیوں کی بھی چنداں ضرورت نہیں۔ بلکہ آئے دن اس ہندوستان میں ہونے والے فسادات یا نوکریوں اور کاروبار میں برتا جانے والا امتیازی سلوک ہی اس کے لیے کافی ہے۔ لیکن جب فکری گہرائیوں میں اسلامی اقدار کی تلاش و ترسیخ کی بات کی جائے گی تو ہم کو یہ دیکھنا ہوگا کہ ہمارا تصور دین اسلام کو "دین فطرت" قرار دیتے ہوئے

یہ مضمون پیام نو مورخہ ۲/۲/۱۹۹۰ء کی اشاعت میں شائع ہو چکا ہے

بات پر اللہ اور اس کا رسول خاموش رہ جاتے ؟

ہم جب جاہل اور مفسد ذاکرین پہ سخت تنقید کرتے ہیں تو اس کی وجہ یہی ہے کہ ان لوگوں نے جو طرز خطابت ایجاد کر لیا ہے اور غیر ضروری باتوں کو بنیاد بنا کر ایمان اور کفر کے فتوے دینے لگے ہیں وہ اللہ کی کھلم کھلا بغاوت اور دین کا مضحکہ اڑانا ہے۔ ان لوگوں نے اپنی جہالت سے "عقائد کے بت" تراش لیے ہیں۔ جو اُن کے بیان کردہ فضائل، مصائب یا معجزات کو صرف زبانی جمع خرچ پہ نہ مانے بلکہ علماء کی کتابوں کے حوالے مانگے تو بجائے اس کے کہ یہ اپنی کوتاہ نگاہی اور کم علمی کا اعتراف کر لیں اُلٹے دوسرے کو کافر اور دشمن اہل بیت قرار دینے لگتے ہیں۔

ان جاہل ذاکرین کے منھ سے آپ اہلِ سنت کے علماء کے نام اور ان کی کتابوں کے حوالے سنیں گے مگر کبھی نہ تو یہ شیعہ علماء کا نام لیتے ہیں اور نہ ہی شیعہ علماء کی بنیادی کتابوں کا حوالہ دیتے ہیں۔ امام شافعی، امام ابو حنیفہ، امام فخر الدین رازی، علامہ زمخشری، علی میاں ندوی، صحیح مسلم، صحیح بخاری، مشکوٰۃ شریف، یہ سب نام آپ نے ان لوگوں سے سنے ہوں گے۔ مگر کبھی آپ نے شیخ مفید، شیخ طوسی، سید علی ابن طاؤس، شیخ صدوق، کتاب الارشاد، کتاب لہوف کے نام ان لوگوں سے نہیں سنے ہوں گے۔ ایسا کیوں ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ بے ہودہ ذاکرین کی ٹولی جو باتیں منبروں سے بیان کر کے قوم میں تفرقہ پیدا کرتی ہے۔ ان کا یا تو کوئی تذکرہ ہمارے اولین علماء نے کیا ہی نہیں ہے اور اگر کیا بھی ہے تو جو یہ لوگ بیان

کر رہے ہیں اس کے خلاف کیا ہے۔ یہ لوگ نہ صرف یہ کہ قرآنی آیات کے غلط اور گمراہ کن معنٰی بیان کرتے ہیں، من مانی تفسیریں کرتے ہیں، بلکہ یہ افرادِ ملت اور حقیقی علماء کے بیچ دیوار بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔

کیا کبھی آپ نے سنا کہ ایران یا عراق سے کوئی شخص علم دین حاصل کرنے لکھنؤ آیا ہو؟ ہمیشہ یہیں کے لوگ نجف اور قم علم دین حاصل کرنے جاتے رہے ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟ اس کے معنٰی یہی ہیں کہ ہمارے علمی مراکز نجف اور قم ہیں اور حقیقی علماء بھی وہیں ہیں۔ ہم نے کتنی دفعہ اعلان کیا ہے کہ ہماری تحریریں حقیقی علماء کی کتابوں کی روشنی میں لکھی جاتی ہیں ہم نے یہ بھی اعلان کیا کہ اگر کوئی صاحب ایران و عراق کے جید علماء سے ہماری تحریروں کے خلاف فتوٰی حاصل کریں گے تو ہم ان کو ایک ہزار روپیہ نقد انعام دیں گے۔ ہونا یہ چاہیے تھا کہ یہ مفسد ذاکرین ایک نہیں درجنوں فتوے لے آتے۔ مگر ان کا ایک بھی فتوٰی نہ لانا بتا رہا ہے کہ یہ ہماری حقانیت اور صداقت پر ایمان رکھتے ہیں مگر اپنے جھوٹ کا بھرم قائم رکھنے کے لیے عوام کو اشتعال دلانے کی ناپاک کوششیں کرتے رہتے ہیں۔ کیونکہ اپنی دروغ بیانیوں سے انھوں نے جو باطل عقائد کے بت تراش لیے ہیں وہ جب قرآن و حدیث کی بات ہوگی تو اپنے آپ ٹوٹ جائیں گے۔

آپ کو یاد ہوگا کہ جب پیام نو میں مندرجہ ذیل تحریر شائع ہوئی تو ان لوگوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ جاوید مرتضٰی صاحب نے معاذاللہ

جناب فضہ کو نجس کہہ دیا۔

پیامِ نو کی تحریر

"یہ مفسد ذاکرین عوام کو گمراہ کرنے کے لیے جذبات کو بھڑکاتے ہیں اور اپنی جھوٹی خطابت کے برساتی نالوں سے سچ کو جھوٹ کی تاریکیوں میں لپیٹنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جذبات بھڑکانے کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ لوگ جذبات میں اندھے ہو جائیں اور عقل کو استعمال نہ کریں۔

آپ غور فرمائیں کہ جن مسائل کو چھیڑ کر عوام کو گمراہ کیا گیا ہے اور قوم میں انتشار کو پھیلایا گیا وہ کیا تھے اور ان کا حل کیا ہے؟

مثال کے طور پر مولانا غلام عسکری صاحب قبلہ مرحوم پر لعن طعن اس لیے کیا گیا کہ تنظیم المکاتب کے اخبار میں آقائے خوئی کا فتویٰ شائع ہوا کہ حالت نجاست میں امام باڑوں میں جایا جا سکتا ہے۔ اس مسئلہ پر منبروں سے کیا کیا آفت نہیں مچائی گئی۔ کوئی ان سے نہیں پوچھتا کہ امام باڑہ زیادہ محترم ہے یا جناب سیدہ کا گھر؟ اگر جناب سیدہ کے گھر میں جناب فضہ رہ سکتی ہیں اور مہینے کے مخصوص ایام بھی وہیں گذارتی ہیں تو پھر فالتو بحث کیسی؟

اسی طرح کیا حنظلہ غسیل الملائکہ حالت جنابت میں رسول اکرمؐ کے ساتھ نہیں رہے اور اسی حالت میں شریک جہاد نہیں ہوئے؟ پھر جب آقائے خوئی کا فتویٰ ہے تو آقائے خوئی کو برا بھلا کہو، مولانا

غلام عسکری صاحب کو کیوں الزام دیتے ہو؟"

(حوالہ دین فہمی حصہ اول ص۱۴۷)

آپ بتائیے، کیا اس عبارت میں جناب فضہ کو "نجس" کہا گیا ہے؟ مگر بعض مفسد ذاکرین نے اس طرح منبروں سے جھوٹ بولا جس کا جواب شاید یزید کے دور میں بھی نہ ملے۔ اگر کوئی صاحب آیۂ تطہیر میں لفظ "رجس" کے معنیٰ یہ لیتے ہیں کہ اس سے مراد پیشاب، پاخانہ، حیض، نفاس و جنابت والی فطری نجاستیں ہیں اور یہ کہ رسولؐ و آلِ رسولؐ کی بزم میں آنے والے تمام افراد ان فطری باتوں سے مبرّا تھے تو وہ یہ بتائیں کہ آیۂ تطہیر کے یہ معنیٰ کس عالم نے بیان کیے ہیں؟ یہ شیعہ عقیدہ تو نہیں ہے بلکہ یہ عقیدہ تو سراسر خلاف شیعیت ہے۔ ان مفسد ذاکرین نے محض عوام کو اشتعال دلانے کے لیے جناب فضہ کا نام لیا ورنہ جناب حنظلہ غسیل الملائکہ کے حالت جنابت میں رسولؐ کے ساتھ شریک جہاد ہونے کی بات تو صاف صاف لکھی تھی اس کا کیوں نہیں تذکرہ کیا۔

اگر واقعی ان لوگوں کو طہارت و نجاست کے مسئلہ میں دلچسپی ہے اور یہ نیک نیت ہیں تو کیوں نہیں یہ لوگ آنکھ کھول کر شیعہ سماج پر غور کرتے؟ کیا یہ قومی المیہ نہیں ہے کہ ہمارے کتنے ہی محلوں میں ایسی لڑکیاں موجود ہیں جو ایک طرف کنیزانِ سیدہ ہونے کی دعوے دار ہیں اور دوسری طرف اپنے جسموں کا سودا کر رہی ہیں۔ ہر لڑکی جو اس طرح بے راہ رو ہو رہی ہے کل اُسی کے ذریعہ سے کتنی لڑکیاں

اور اسی راہ پر پہنچ جائیں گی اس کا کوئی اندازہ آپ کو ہے؟ کیا اس روش سے جناب سیدہ اور اہل بیت اطہارؑ کی عزت افزائی ہو رہی ہے یا یہ کہ توہین ہو رہی ہے؟

جن لوگوں نے دین کے مفہوم کو بدل کر لوگوں کے ذہنوں میں یہ زہر گھول دیا ہے کہ چونکہ تم پیدائشی شیعہ ہو، تم محبت اہل بیت پر پیدا کیے گئے ہو لہٰذا تم چاہے جوا کھیلو، لاٹری کا کاروبار کرو، ڈاکہ ڈالو، اوقاف کی جائدادیں لوٹ کھاؤ، لڑکیوں کی دلالی کرو، واجبات کا مضحکہ اڑاؤ جو چاہے کرو، جہنم کی آگ تم پر حرام ہے۔ جنت تو تمھاری آمد کی مشتاق ہے، وہی لوگ اس تباہی کے اصل ذمہ دار ہیں۔

اگر آج ہمارے علماء، خطباء و واعظین یہ طے کرلیں کہ ہم صحیح تقریریں کریں گے اور غلط روش پر چلنے والے لوگوں سے اظہار برأت کریں گے ان کے یہاں کی تقریبات میں شرکت نہیں کریں گے تو کھُلّم کھُلّا ان برائیوں میں ملوث ہونے والوں کی تعداد میں اپنے آپ نمایاں کمی ہو جائے گی۔

لاعلمی اور جہالت میں فرق

کسی چیز کا علم نہ ہونا اس شے سے لاعلمی کہلاتا ہے۔ اس حیثیت سے عالم مطلق صرف ذات باری تعالیٰ ہے۔ جب خود رسول اکرم کو حکم دیا گیا "وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِي عِلْمًا" (سورہ طٰہٰ آیت ۱۱۴) "اور دعا کرو کہ اے میرے رب تو میرے علم کو اور زیادہ کر"۔ تو آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ عالم مطلق ہونے کا مدعی کوئی انسان نہیں ہو سکتا۔ انسان اس دنیا میں آتا ہے تو کچھ علم نہیں رکھتا بس اس کو علم حاصل کرنے کی صلاحیتوں کے ساتھ بھیجا جاتا ہے۔ چنانچہ سورہ نحل کی ۷۸ ویں آیت میں ارشاد ہوا:

وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا ۙ وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۙ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝ "اور اللہ ہی نے تمھیں تمھاری ماؤں کے پیٹ سے نکالا (جب) تم کچھ بھی نہ جانتے تھے اور تم کو کان دیے اور آنکھیں (عطا کیں)، دل (عنایت کیے)، تاکہ تم شکر کرو"۔

اب اگر انسان صحیح معنیٰ میں اللہ کا شکرگزار بندہ ہے تو وہ اللہ کی عطا کردہ سننے، دیکھنے اور غور و فکر کرنے کی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے

یہ مضمون پیام نو مورخہ ۲۲ دسمبر ۱۹۸۹ء کی اشاعت میں شائع کیا جا چکا ہے

ہوئے حصول علم کرے گا اور اپنے علم کے ذریعہ سے اللہ کی معرفت اور اس کی اطاعت کی راہوں میں اپنے خالق کے حضور عجز و انکساری کے ساتھ آگے بڑھتا جائے گا۔

ہر انسان سے اس بات کا سوال کیا جائے گا کہ اس نے اپنی سننے، دیکھنے اور سوچنے کی صلاحیتوں کو کس طرح استعمال کیا۔ چنانچہ یہ آگاہی سورۂ بنی اسرائیل کی ۳۶ ویں آیت میں یوں دی گئی۔

اِنَّ السَّمۡعَ وَالۡبَصَرَ وَالۡفُؤَادَ کُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنۡهُ مَسۡـُٔوۡلًا "بے شک کان اور آنکھ اور دل ان سب کی (قیامت کے دن) یقیناً باز پرس ہوتی ہے۔"

اس طرح لاعلمی بذات خود بری چیز نہیں ہے اور نہ ہی اس کو "جہالت" کہتے ہیں۔ ہاں جب کوئی شخص اللہ کی عطا کردہ صلاحیتوں کو صحیح ڈھنگ سے استعمال نہیں کرتا۔ حصول علم کے لیے جستجو نہیں کرتا یا یہ کہ کسی حقیقت کا علم ہو جانے کے باوجود اس کا انکار کرتا ہے تو ایسی صورت میں وہ جہالت کا مرتکب ہوتا ہے یعنی لاعلمی پر "اصرار" کا نام "جہالت" ہے۔

اس طرح لکھا پڑھا نہ ہونا اور چیز ہے اور جہالت اور چیز ہے۔ ہو سکتا ہے کوئی شخص دستخط کرنا بھی نہ جانتا ہو مگر حقیقتوں سے واقفیت کا جذبہ اس میں پایا جاتا ہو۔ حق کو قبول کرنے سے اسے کوئی گرانی نہ محسوس ہوتی ہو تو وہ جاہل نہیں کہلائے گا بلکہ اگر وہ نیکی اور تقویٰ کی

راہ پر گامزن ہو، خوف الٰہی کا جذبہ اس میں ہو تو قرآن اس کے عالم ہونے کی گواہی دے گا۔ سورۂ فاطر کی ۲۸ ویں آیت میں ارشاد ہوا

اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا ط

"بس اللہ سے وہی بندے ڈرتے ہیں جو علم رکھتے ہیں"

اس کے برخلاف جو شخص ڈگریاں رکھتا ہو مگر اللہ کی معرفت و اطاعت سے بیگانہ ہو، تو وہ جاہل ہوگا چاہے دنیا اس کو جتنے لمبے چوڑے القاب و آداب سے نوازے۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر

فروع دین میں ساتویں نمبر پر "امر بالمعروف" اور آٹھویں نمبر پر "نہی عن المنکر" آپ کو یاد ہی ہو گا۔

لفظ "معروف" عرفان اور معرفۃ سے مشتق ہے۔ "معروف" کے لغوی معنی ہوئے "جانی پہچانی ہوئی بات" شرعی اصطلاح میں معروف ہر اُس بات کو کہتے ہیں جس کا مستحسن ہونا نقل صحیح یا عقل سلیم سے جانا گیا ہو۔

امام راغب اصفہانی کے مطابق "اَلْمَعْرُوْفُ" ہر اس قول یا فعل کا نام ہے جس کی خوبی عقل یا شریعت سے ثابت ہو اور "منکر" ہر اس بات کو کہا جائے گا جو عقل و شریعت کی رو سے بُری سمجھی جائے۔

اس بیان کے مطابق منکر محرّمات اور مکروہات دونوں کو شامل ہو جائے گا خلاصہ یہ کہ "معروف" کے معنی نیک عمل اور "منکر" کے معنی برا کام۔ اسی طرح "امر" کے معنی حکم دینا اور "نہی" کے معنی روکنا اور منع کرنا ہے "امر بالمعروف" کے معنی نیک عمل بجالانے کا حکم دینا اور "نہی عن المنکر" کے معنی برے کاموں سے روکنا ہے۔

یہاں پر ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے۔ بعض لوگوں کے نزدیک

یہ مضمون پیام نو مورخہ ۲۹ر دسمبر ۱۹۸۹ء کی اشاعت میں شائع ہو چکا ہے

"معروف" یعنی "جانی پہچانی ہوئی بات" کا مفہوم وہ اخلاقی اقدار ہیں جو تمام مذاہب اور انسانی گروہوں میں اچھی مانی جاتی ہیں۔ (مثلاً سچ بولنا، پڑوسی کے ساتھ حسن سلوک، غریب کی مدد وغیرہ) اور منکر سے مراد وہ اخلاقی برائیاں ہیں جو تمام انسانی برادری میں بری مانی جاتی ہیں۔ (مثلاً چوری کرنا، فریب دینا، جھگڑا کرنا وغیرہ) یعنی ایسے افراد معروف و منکر کو جمہوری پیمانے پر تولتے ہیں۔ ان کے نزدیک امر بالمعروف و نہی عن المنکر صرف انھیں مسائل میں کیا جائے جس کو سب لوگ مان لیں یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے وقت کوئی بات عوامی مزاج کے خلاف نہ کہی جائے۔ اس طرز فکر کے علمبردار اگر کسی ایسے ملک میں ہوں گے جہاں شراب نوشی عام ہو تو وہاں شراب کے خلاف کچھ نہیں کہیں گے۔ جہاں سور کا گوشت کھانا دستور بن گیا ہو وہاں ان کے نزدیک وہ معروف میں داخل ہوگا۔ اسی طرح جن ممالک میں سود خوری یا ہم جنسی میں کوئی قباحت نہیں ہے وہاں یہ لوگ ان برائیوں کو برائی نہ مان کر اچھائی تسلیم کرلیں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ معروف کا پیمانہ عوامی مزاج یا رجحان نہیں ہے۔ بلکہ معروف کو اس لیے "جانی پہچانی ہوئی بات" کہا گیا کیونکہ اللہ نے ہر نفس پر الہام کردیا ہے کہ نیکی کیا ہے، بدی کیا ہے؟ چنانچہ سورہ الشمس میں ارشاد ہوا

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۝ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝

قسم ہے نفس انسانی کی اور جیسا اسے سنوارا، پھر اسے بدکاری اور پرہیزگاری کی سمجھ عطا کی۔ (سورہ شمس: آیات ۷، ۸)

اس طرح معروف و منکر کو پرکھنے کا پیمانہ الہام الٰہی، وحی الٰہی (یعنی قرآن) اور عقل سلیم اور فہم مستقیم ہے۔

امام حسین علیہ السلام نے اپنے اقدام کی بنیاد امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو قرار دیا تھا۔ مدینہ سے روانگی کے وقت جو وصیت نامہ لکھ کر آپ نے محمد بن حنفیہ کو دیا تھا اس میں توحید و رسالت اور حشر و نشر کے اقرار کے بعد لکھا تھا:

اِنِّیْ لَمْ اَخْرُجْ اَشِرًا وَّ لَا بَطِرًا وَّ لَا مُفْسِدًا وَّ لَا ظَالِمًا وَ اِنَّمَا خَرَجْتُ لِطَلَبِ الْاِصْلَاحِ فِیْ اُمَّةِ جَدِّیْ۔ اُرِیْدُ اَنْ اٰمُرَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ اَنْھٰی عَنِ الْمُنْکَرِ وَ اَسِیْرَ بِسِیْرَةِ جَدِّیْ وَ اَبِیْ۔ یعنی "میں سرکشی اور جنگ و جدل کے ارادے سے نہیں نکل رہا ہوں اور نہ ہی میرا مقصد فساد پھیلانا یا کسی پر ظلم کرنا ہے بلکہ میں تو اپنے نانا کی امت کی اصلاح کے لیے نکلا ہوں۔ میری غرض فقط امر بالمعروف، نہی عن المنکر اور اپنے اب و جد کی پیروی ہے۔"

امام حسین علیہ السلام کس امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لیے نکل رہے تھے؟ کیا وہ یہ کہنے کے لیے نکلے تھے کہ "لوگو! سچ بولو، نماز کی پابندی کرو، پڑوسیوں کا خیال رکھو، جھوٹ نہ بولو، دھوکہ نہ دو، قرآن پڑھو، اللہ کو یاد کرو وغیرہ وغیرہ۔ اگر محض ان ہی غیر اختلافی باتوں کا نام امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہوتا تو یہ کام مدینہ میں ہی رہ کر کر سکتے تھے اور نہ اس قسم کے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لیے وہ اور ان کے انصار و اعزا قتل کیے جاتے۔

درحقیقت امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے دو پہلو ہیں۔

۱۔ اپنے نفس کو معصیتِ الٰہی سے ہٹا کر اطاعت الٰہی کی راہ پر لگانا۔ اس کو تزکیۂ نفس یا جہاد بالنفس کہتے ہیں۔

۲۔ اپنے معاشرہ یا سماج میں پھیلی ہوئی برائیوں کو دور کر کے معاشرہ کو اسلامی اقدار کی بنیادوں پر استوار کرنا۔ اسی کو جدید اصطلاح میں "انقلاب اسلامی" کہتے ہیں۔

اس دوسرے وسیع مفہوم کی پابندی تب ہی ممکن ہوگی جب ہم اپنے معاشرہ میں پھیلی ہوئی اصل خرابی کی نشان دہی کریں اور اسی کی اصلاح کی کوشش کریں۔ اصل خرابیوں سے منھ موڑ کر جزوی اور غیر اختلافی باتوں کو ہی ہدف بنالینا بزدلی اور کام چوری تو کہلا سکتا ہے مگر اس کو اس فریضۂ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی ادائیگی نہیں قرار دیا جا سکتا جس کو حضرت علی علیہ السلام نے اپنی زندگی کے آخری لمحات میں وصیت کرتے ہوئے بیان کیا تھا:

"امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو ترک نہ کرنا۔ اگر تم امر بالمعروف و نہی از منکر کو چھوڑ دو گے تو بدترین لوگ تم پر مسلط ہو کر حکومت کریں گے اور جس زمانہ میں بدترین لوگ حکومت کریں گے تو تم جو دعا بھی کرو گے اُسے خدا مستجاب نہیں فرمائے گا۔"

ہمارا مقصد

مولانا کلب عابد صاحب قبلہ مرحوم نے مجھے ۱۹۸۲ء میں علی کانگریس کا جنرل سکریٹری مقرر کیا تھا۔ اس وقت تک میں ایک عام شیعہ کی حیثیت سے زندگی گزار رہا تھا یعنی ملت شیعہ کی ایک عام فرد کہ جس کو شیعان لکھنؤ کی سماجی اور اجتماعی زندگی کی گندگیوں کی کوئی خبر نہ ہو۔ جس کے نزدیک ہر صاحب عمامہ لائق تعظیم اور ہر مجلس پڑھنے والا ذاکرِ حسینؑ اور محترم شخصیت ہوتا ہے۔ علی کانگریس کا جنرل سکریٹری بننے کے پیچھے میرا یہی جذبہ محرک تھا کہ میں جلوسہائے عزا کی بحالی کے لیے کوشش کروں۔ چنانچہ میں نے اس مقصد کو اوّلین فریضہ قرار دیتے ہوئے 'حَیَّ عَلیٰ خَیْرِ الْعَمَلِ' کے عنوان سے پمفلٹ شائع کیے اور محلوں محلوں مختلف مساجد میں افراد ملت سے رابطہ قائم کیا۔ اس وقت میرے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ جلوسہائے عزا کی بحالی کی تحریکوں کی مخالفت خود شیعہ حضرات بھی کر سکتے ہیں۔ مگر یہ تلخ حقیقت جلد ہی مجھ پر عیاں ہو گئی کہ جہاں عوام نے جلوسہائے عزا کی بحالی کے لیے مثالی قربانیاں پیش کیں وہیں خواص نے در پردہ اور کھلم کھلا دونوں طریقوں سے جم کر مخالفت کی اور حیرت کی بات یہ ہے کہ جن لوگوں کی جانب سے آج ہم کو

یہ مضمون مورخہ ۱۹ار۱ر۹۰ء کی اشاعت میں پیام نو میں شائع ہو چکا ہے

دشمن اہل بیت اور وہابی ایجنٹ ہونے کا فتویٰ دیا جا رہا ہے یہ وہی لوگ ہیں کہ جنھوں نے جلوسہائے عزا کی بحالی کی تحریکوں کا یا تو بائیکاٹ کیا اور یا پھر باقاعدہ مخالفت کی۔ ہم کسی فرد، تنظیم یا انجمن کا نام لے کر مزید تلخی نہیں پیدا کرنا چاہتے ہیں مگر باشعور افراد سے یہ گذارش کرتے ہیں کہ وہ یہ غور کریں۔ حالیہ دس برسوں میں مختلف قومی شخصیتوں، تنظیموں اور انجمنوں نے عزاداری کے جلوسوں کی بحالی کے لیے کیا کیا ہے؟

جلوسہائے عزا کی بحالی کی تحریکوں کے دوران مجھے قوم کے حالات کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ میں نے اس بات کو شدت کے ساتھ محسوس کیا کہ افراد ملت کی اکثریت نہ صرف یہ کہ دین کی بنیادی باتوں سے بے خبر ہے بلکہ ان کی فکروں کو بھی مفلوج کر دیا گیا ہے۔ افراد ملت خیام حسینی کی تاراجی پر تو آنسو بہاتے ہیں مگر نام حسین ؑ پر وقف کی جانے والی جائدادوں کی تباہی اور لوٹ کی طرف ان کی کوئی توجہ نہیں ہے۔ کفّار مکّہ کا اپنی لڑکیوں کو زندہ دفن کر دیا جانا سنتے ہیں مگر خود اپنے معاشرہ میں کتنی لڑکیاں بن بیاہی رہ گئیں یعنی رسومات میں زندہ دفن ہو گئیں اس پر کوئی توجہ نہیں۔ امام حسین ؑ پر مظالم کا تذکرہ سنتے ہیں مگر بغیر شرعی جواز کے دوسرے کو اذیت دینا اور ظلم کرنا مذہبی فریضہ سمجھتے ہیں۔ جس طرح طوفان میں پھنسی ہوئی کوئی ناؤ موجوں کے تلاطم میں ہچکولے کھاتی ہے اسی طرح قوم کی اکثریت جذبات کے بھنور میں توچکّر کاٹ لیتی ہے مگر عقل و فکر کو مذہب کے معاملہ میں استعمال نہیں کرتی۔

علماء و ذاکرین بجائے اس کے کہ افراد ملت کو سیرت معصومین علیہم السلام

سے باخبر کرائیں اور علوم اہل بیت سے متعارف کرائیں، عوام کو مخالف سمت لے جانے میں لگے ہوئے ہیں۔ یعنی عوام کو ذہنی غلامی کی زنجیروں میں جکڑ دیا گیا ہے۔ اسی درمیان میں مجھے دورِ حاضر کے ایران و عراق کے علماء و مفکرین کی کتابیں پڑھنے کا موقع ملا، دورِ اول کے علماء کی تحریریں بھی دستیاب ہوئیں اور مطالعہ قرآن کا شغف بھی بڑھا۔ میرے مطالعہ اور فکر نے مجھے اس منزل پر پہنچا دیا کہ جہاں میں دین کے ان دو تصورات میں واضح فرق کر سکوں جو میرے سامنے تھے۔ ایک دین کا وہ تصور ہے کہ جو قرآن میں موجود ہے جس کی تبلیغ رسول اکرمؐ نے کی، جس پر عمل پیرا ہو کر ائمۂ طاہرین علیہ السلام نے ہمارے لیے نمونۂ عمل پیش کیا اور جس دین کی جھلکیاں ایران و عراق کے علمائے حق کی تحریروں میں موجود ہیں اور جس دین کی حفاظت کی خاطر امام حسین علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں نے بے مثال قربانیاں پیش کیں۔

اس دین کے مقابلہ میں دوسرا دین وہ ہے جو ذاکرین منبروں سے بیان کر رہے ہیں، جس پر ہمارے یہاں کے علماء کی بے عملی گواہی دے رہی ہے اور جس کا عملی نمونہ مذہبی امور میں عام بے حسی، جائدادوں کا لٹنا، عزت کے بجائے ذلت کو اپنا لینا، حرام طریقوں سے مال کا کمانا، جوا اور لاٹری کا معاشرہ میں پنپنا، معاشرتی زندگی میں نفاق، حسد اور ریاکاری کا پوری طرح سرایت کر جانا، علماء کا خاموش تماشائی بنا رہنا، ذاکرین کا نفرت کی آگ بھڑکانا اور مومنین کرام کا گالم گلوچ اور بے ہودگیوں کو اپنا شعار بنا لینا ہیں۔ ہر شخص دوسرے کا عقیدہ اور کردار تو لنے کو تیار رہے مگر اپنے اعمال

اور انجام سے بے پرواہے۔

اب دین کا کون سا تصور درست سمجھا جائے۔ تو صورت حال میرے سامنے بالکل واضح تھی۔ جو قوم صراطِ مستقیم پر گامزن ہوگی، جو قوم ایمان کے جادہ پر قائم ہوگی وہ ذلیل و خوار نہیں ہوسکتی۔ ذلت اور پستی میں کسی قوم کا پڑا رہنا اس کا اللہ کے غضب میں مبتلا ہونے کی علامت ہے اور اس بات کا نتیجہ ہے کہ افراد ملت معصیت الٰہی میں مبتلا ہیں۔ جب تک ہم کفر و نفاق کے راستے کو چھوڑ کر ایمان کے راستے پر نہیں آئیں گے، جب تک ہم معصومین علیہم السلام کی سیرت کا اتباع نہیں کریں گے ہمارے حالات بہتر نہیں ہو سکتے اور یہ تب ہی ممکن ہے کہ جب ہم میں دین کو سمجھنے اور اس پر عمل پیرا ہونے کا جذبہ فروغ پائے۔ اور جب تک دین کی سمجھ اور اس کا اتباع نہیں ہوگا ہر بڑھتا ہوا قدم ہم کو اُلٹے پستی میں لے جائے گا۔

مثال کے طور پر اور بطور عبرت میں ایک واقعہ آپ کے سامنے پیش کیے دیتا ہوں۔ جامع مسجد تحسین گنج کے پاس ایک امامباڑہ اور وقف کی جائداد ہے جو وقف منّے نواب صاحب یا وقف سجّادیہ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ برسوں سے اس میں تالا بند تھا، مراسم عزاداری انجام نہیں دیے گئے تھے۔ خاندان کے کچھ افراد اس امامباڑہ پر قابض تھے اور شیعہ وقف بورڈ کی مقرر کردہ کمیٹی کے ممبران سے جھگڑا چل رہا تھا۔ وقف بورڈ کی مقرر کردہ کمیٹی کے کسی ممبر کی یہ ہمت نہیں تھی کہ اس امامباڑہ میں قدم رکھ سکے۔ ہماری تنظیم کے ممبران کی مداخلت سے برسوں بعد اس امامباڑہ کا تالا

کھُلا، شیعہ وقف بورڈ کی کمیٹی کو چارج دلوایا، مگر جب شیعہ وقف بورڈ نئی کمیٹی کی تشکیل دیتا ہے تو اس کمیٹی میں ایک ایسی فرد بھی شامل ہوتی ہے کہ جو اکیلے ہی پورا اما مباڑہ بیچ ڈالنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ ایک اور وقف میں اُن کی بے ایمانی اور بدعنوانی کے بارے میں ہم لوگ پہلے ہی شکایت کر چکے تھے مگر بجائے اس کے کہ اُنھیں اُس وقف کی تولیت سے ہٹایا جاتا دیگر اوقاف کی کمیٹیوں میں بھی ان کو ممبر بنا دیا گیا۔ اور دوسرا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ جب اس اما مباڑے میں تالا کھلنے کے بعد عشرۂ مجالس کا انعقاد ہوا تو ایسے صاحب نے مجلس پڑھی کہ جن کے نزدیک یزید تو چھوٹا دشمن اہلبیتؑ ہے مگر جاوید مرتضیٰ کو وہ بڑا دشمن اہلِ بیتؑ سمجھتے ہیں۔

جس طرح کی مجلسیں ہوتی ہیں، جس طرح بدی، غیبت، تہمت اور بہتان تراشی کو مجلسوں میں ضروری جز بنا لیا گیا ہے اور جس طرح دین کی صورت کو بنامِ حسین مسخ کیا جا رہا ہے وہ سب عبادت نہ ہو کر گناہ کا ذریعہ بن گئی ہیں۔

مولانا کلب عابد صاحب قبلہ مرحوم کے بعد ہم نے ہر طرف نگاہ دوڑائی کون ان بد سے بدتر ہوتے ہوئے حالات سے مقابلہ کرے؟ کون ہے جو عوامی رجحان سے ٹکرائے؟ کون ہے جو قوم کے سامنے اس بڑھتے ہوئے بے دینی کے سیلاب پر بندھ باندھے؟ کون راہ حق میں اپنی شخصیت کو قربان کرنے سے دریغ نہ کرے؟ کون گالیاں کھانے کو تیار ہو اور آگے بڑھے؟ جب ہر طرف سے مایوسی ہوئی تو پھر یہی طے کیا کہ ہم لوگ خود اس

کام کو کریں گے۔ "دین فہمی" کے عنوان سے کچھ مضامین مولانا کلب عابد صاحب قبلہ مرحوم کی زندگی میں ہی شائع ہو چکے تھے لہٰذا اسی سلسلہ کو آگے بڑھایا گیا۔

ہونا یہ چاہیے تھا کہ لکھنؤ کے علماء و ذاکرین ہم لوگوں کی ان کوششوں کو سراہتے کہ وہ لوگ کہ جو کوئی علمی پس منظر نہیں رکھتے ہیں، جن لوگوں نے باقاعدہ دینی مدرسوں میں تعلیم نہیں حاصل کی، جنھوں نے دین کو دنیا حاصل کرنے کا ذریعہ نہیں بنایا مگر جو دین کی خدمت کے جذبہ کے تحت کام کر رہے ہیں، اُن کی ہمت افزائی کی جائے۔ اگر کہیں کوئی لغزش یا خطا پاتے تو نرم روی کے ساتھ ہدایت فرماتے۔ اگر ان کے نزدیک ان تحریروں سے قوم میں گمراہی پھیل رہی تھی تو خود اس کام کو اپنے ہاتھ میں لیتے۔ اختلافی مسائل میں آمنے سامنے بیٹھ کر گفتگو کرتے۔ وہ اپنے دلائل پیش کرتے ہم اُن کی بات قبول کرتے یا جوابی دلائل پیش کرتے۔ اگر کوئی بیچ کی راہ نہ نکلتی تو ایران و عراق کے علماء سے ہدایت طلب کر لی جاتی، کوئی بڑا مسئلہ نہ بنتا۔ مگر علمی گفتگو کرنا کیسا؟ وہاں تو فوراً ہی دشمن اہل بیت اور وہابی ایجنٹ ہونے کا سرٹیفکٹ دے دیا جاتا ہے۔ کاش یہ لوگ اتنا ہی غور کر لیتے کہ جن لوگوں نے جلوسہائے عزا کی بحالی کی تحریکوں تک میں قوم سے ایک پیسہ بھی چندہ نہ لیا وہ کیوں کر قوم فروشی کر سکتے ہیں؟

بہر حال ہم اس بات کو واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ ہمارا مقصد اصلاحِ قوم ہے۔ اس اصلاح قوم کی پہلی منزل لوگوں کو دین کی پابندی کی طرف متوجہ کرنا، دین کا فہم پیدا کرنا اور لوگوں کی فکروں کو بیدار کرنا ہے۔ کیونکہ ان کوششوں

کا مقصد معاشرہ کی سمت بدلنا ہے۔ کفر و نفاق کی غلاظتوں سے نکال کر ایمان اور تقویٰ کی راہ دکھانا ہے۔ لہٰذا عقیدوں کا ٹکراؤ بھی ہوگا اور شخصیتوں کا ٹکراؤ بھی ہوگا۔ ہم اللہ ہی پر بھروسہ کرتے ہیں، اسی سے مدد طلب کرتے ہیں اور دین کی راہ میں جان دینا اپنی سعادت و خوش بختی سمجھتے ہیں۔ ہمیں قوم کے روشن مستقبل پر پورا بھروسہ ہے اور ہمیں یقین کامل ہے کہ وہ وقت دور نہیں ہے کہ جب لوگ نہ صرف یہ کہ حق سے واقف ہو جائیں گے بلکہ ان کو حق کی کسوٹی پر شخصیتوں کو پرکھنا بھی آجائے گا۔

اللہ سے دعا ہے کہ وہ ہماری اس سعی کو قبول فرمائے، میری اور میرے ساتھیوں کی توفیقات میں اضافہ فرمائے، ہماری خطاؤں سے درگذر فرمائے ہمیں شرح صدر عطا فرمائے تاکہ ہم اُس کی اطاعت و عبادت بہتر طریقہ پر انجام دے سکیں (آمین)۔

نئی نسل کی فکری تربیت

(۱۸، ۱۹ اور ۲۰ جنوری ۱۹۹۰ء کو جامعۃ الثقلین (دہلی) کے زیرِ اہتمام غالب اکیڈمی، نئی دہلی میں "امام امت آیۃ اللہ خمینی بین الاقوامی سمینار" کا انعقاد کیا گیا۔ اس سمینار میں "نئی نسل کی فکری گہرائیوں میں اسلامی اقدار کی تلاش و ترسیخ" کے عنوان سے ۱۹ جنوری ۱۹۹۰ء کو جو مقالہ میں نے پیش کیا اس کا آخری جز قارئین پیام نو کی خدمت میں پیش ہے۔)

میں جب موجودہ صورت حال کا تجزیہ کرتا ہوں تو یہ پاتا ہوں کہ ہماری پرانی نسل نے نئی نسل کو جو دین کا تصور منتقل کیا ہے وہ، وہ شعوری ایمان والا دین نہیں ہے جس کا تقاضہ قرآن کریم کرتا ہے۔ جہاں تک اس احساس کا سوال ہے کہ ہم مسلمان ہیں یا یہ کہ ہمارے مذہب کا نام اسلام ہے تو اس کے لیے قرآن، حدیث یا کائنات کی نشانیوں کی بھی چنداں ضرورت نہیں۔ بلکہ آئے دن اس ہندوستان میں ہونے والے فسادات یا نوکریوں اور کاروبار میں برتا جانے والا امتیازی سلوک ہی اس کے لیے کافی ہے۔ لیکن جب فکری گہرائیوں میں اسلامی اقدار کی تلاش و ترسیخ کی بات کی جائے گی تو ہم کو یہ دیکھنا ہو گا کہ ہمارا تصورِ دین اسلام کو "دین فطرت" قرار دیتے ہوئے

یہ مضمون پیام نو مورخہ ۲/۲/۱۹۹۰ء کی اشاعت میں شائع ہو چکا ہے

یہ بتانے کی کوشش کرتا ہے کہ اس دین کو پوری دنیا میں محض پانچ سات آدمی ہی سمجھ سکتے ہیں اور یہ کہ تمھارے پاس اس مذہب کی پابندی کرنے کا بس یہی ذریعہ ہے کہ یا تو خود اپنی پوری زندگی کسی مدرسہ میں گزاردو یا یہ کہ چند بنیادی عقائد کے اعتراف کے ساتھ پوری زندگی تقلید میں گزاردو اپنے مقلَّد کی بات بغیر دلیل طلب کیے مان لو، اسی پر تمھاری نجات کا دارو مدار ہے۔

ہمارے نزدیک نوجوان نسل کی ایک بڑی تعداد کا دین سے بے بہرہ ہونا اتنا بڑا المیہ نہیں ہے جتنا بڑا المیہ دین سے شغف رکھنے والے افراد کا دین کے معاملات میں عقل و فکر کا استعمال نہ کرنا ہے۔ ہماری نئی نسل جو دین سے شغف رکھتی ہے وہ بس اتنا جانتی ہے کہ اصولِ دین میں تقلید حرام ہے جب کہ فروعِ دین میں تقلید واجب ہے۔ اُس کو یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ جس بنیاد پر اُصولِ دین میں تقلید حرام ہے اسی اصول کی بنا پر اُن فروعی مسائل میں بھی تقلید حرام ہو جائے گی جن کے بارے میں وہ خود علم اور عقل کی بنیاد پر حجت قائم کرلے یا یہ کہ آسانی کے ساتھ حجت قائم کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو اور وہ اصول یہ ہے کہ جس مسئلہ میں خود حجت قائم کرلی ہے، اطمینان حاصل کرلیا ہے اُس کے برخلاف کسی کی بغیر دلیل طلب کیے ہوئے تقلید جائز نہیں ہے۔ میں صرف عام مستعمل لفظیں استعمال کررہا ہوں اس لیے کہ میری تحریروں کے مخاطب متخصصین نہیں ہوتے ورنہ "ادلۂ تفصیلیہ" سے استنباط وغیرہ کی اصطلاحوں سے بھی دراصل یہی مفہوم

حاصل ہوتا ہے جو میں عرض کر رہا ہوں۔ یہ وہ موضوع ہے کہ جس پر کھُل کر بحث ہونی چاہیے۔ ہم یہاں پر صرف مشورہ ہی دے سکتے ہیں کہ اگر ہم لوگوں کو دینی مسائل کو سمجھنے کی تشویق و ترغیب دلائیں گے تو خود ہی لوگوں میں علم حاصل کرنے کی جستجو اور جن مسائل کو خود سمجھ لیا ہے اُن کو دوسروں تک پہنچانے کی ذمہ داری کا احساس بیدار ہوگا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ لغزشیں بھی ہوں گی، غلطیاں بھی ہوں گی، مگر پوری زندگی بیساکھیوں پر بسر کرنے کے مقابلہ میں خود اپنے پیروں پر کھڑا ہونے اور چلنا سیکھنے میں کچھ دور لڑکھڑانا اور ٹھوکریں کھانا بھی پڑے تب بھی کوئی نقصان نہیں رہے گا۔

ہمارے نزدیک قرآن اور احادیث کے ساتھ مختلف مجتہدین کے فتاوی کو پیش نظر رکھتے ہوئے حالات کے مطابق مسئلہ کا حل ڈھونڈھا جائے تو شاید نئی نسل بہتر طریقہ پر دین کے تئیں صحت مند رجحان اپنا سکے۔ یہ صورت "تقلید مطلق" کی بہ نسبت "احتیاط" سے قریب تر ہوگی۔ اپنی بات کی وضاحت کے لیے میں ایک مثال پیش کر رہا ہوں۔

رویت ہلال کے سلسلے سے مقامی رویت اور افق کی مناسبت سے رویت تسلیم کر لینے کے بارے میں دو الگ نوعیت کے فتاوٰی موجود ہیں۔ فتاوٰی کے اس اختلاف کی بنا پر ممکن ہے کہ ایک ہی آبادی یا ایک ہی گھر کے کچھ لوگ رمضان کا تیسواں روزہ رکھے ہوئے ہوں جب کہ باقی لوگ عید منا رہے ہوں۔ یہ اختلافی صورت حال نوجوان نسل کو دین سے متنفر کر سکتی ہے۔ اگر اس سلسلے میں حالات کو بھی پیش نظر رکھا جائے اور یہ اصول طے پا جائے

کہ اسلام اتحاد کو ترجیح دیتا ہے اور یہ چاہتا ہے کہ مسلمان مل جُل کر خوشیاں منائیں تو ایسی صورت میں جب تک کوئی عالمی اسلامی نظام حکومت نہ قائم ہوجائے کہ اس کا اعلان پوری مملکت پر نافذ ہو سکے اس وقت تک مقامی رویت کے حساب سے وہاں کی پوری آبادی ایک ساتھ عید منائے اور جب انشاء اللہ بڑی حکومت قائم ہو جائے تو اس وقت اُفق کے اشتراک والے فتوے کے اعتبار سے سب لوگ ایک ہی دن عید منائیں۔

آخر کلام میں نئی نسل تک اسلامی لٹریچر پہنچانے اور فکری بیداری کے لیے محدود پیمانے پر جو کام ہم لوگ کر رہے ہیں وہ میں آپ حضرات کے سامنے بیان کرنا چاہتا ہوں۔ ہم لوگ پچھلے تقریباً تین سال سے لکھنؤ میں ہر جمعہ کو مسجد آصفی میں ایک پمفلٹ نما اخبار "پیام نو" مفت تقسیم کرتے ہیں۔ اس میں قرآن کریم کی آیات کا ترجمہ، نہج البلاغہ سے اقتباسات و دیگر مضامین ہوتے ہیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ اخبار کی متواتر اشاعت اور تقسیم کے تسلسل سے لوگوں میں مطالعہ کا شغف اور دین فہمی کے ساتھ دین داری میں اضافہ ہوا ہے۔ جو حضرات اپنی آبادی میں نوجوانوں تک دین کا پیغام پہنچانا چاہیں تو اس طریقۂ کار کو وہ انشاء اللہ کافی کارآمد اور نتیجہ خیز پائیں گے۔ آیت اللہ خمینیؒ نے جس اسلامی انقلاب کی بنیاد رکھ دی ہے اُس سے پوری دنیا میں مسلمانوں میں بیداری کی لہر پیدا ہوگئی ہے لیکن اس انقلاب کے ثمرات سے بہرہ مند ہونے کے لیے ضروری ہے کہ ہماری ہر آبادی اور ہر بستی میں ایسے افراد اُٹھ کھڑے ہوں جو ایران سے اٹھنے والی دعوت انقلاب کو فکری بنیادوں پر اپنے معاشرے میں عام کریں۔

یزیدیت کے پروردگار

یزیدیت یزید کی ذات تک محدود نہیں ہے اور نہ ہی امام حسینؑ کو یزید سے کوئی ذاتی رنجش تھی۔ بلکہ یزید کی جگہ کوئی بھی دوسرا شخص ہوتا جو اُسی غلط روش پر ہوتا جو یزید کی روش تھی تو امام حسینؑ اس دوسرے شخص کی بھی ویسی ہی مخالفت کرتے۔ اس طرح امام حسینؑ کا اصل مقابلہ یزید سے نہیں بلکہ یزیدیت سے تھا۔ مگر افسوس جس طرح رسول اکرمؐ کے دین کا پیرو ہونے کا دعویٰ کرنے اور ان کا کلمہ پڑھنے کے ساتھ یزید اور اس کے حواریوں نے شیطانی حرکتیں کیں اسی طرح آج کے دور میں ایک بڑی تعداد ایسے افراد کی ہے جو دعوائے محبت اہل بیتؑ کرتے ہیں جو امام حسینؑ کا بظاہر ماتم کرتے ہیں مگر حقیقتاً وہ خود ہی یزیدیت کا مظہر ہیں۔ جدید یزیدیت کی جانب ہم ماضی میں بھی متوجہ کر چکے ہیں (ملاحظہ فرمائیں کتاب دین فہمی صـ۱۶۳ تا ۱۶۹) لیکن سب سے زیادہ افسوسناک بات یہ ہے کہ حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے ہیں۔ آج کتنے ہی اوقاف ایسے ہیں کہ جن کے متولی شرابی، جواری اور لڑکیوں کی دلالی کرنے والے ہیں۔ جب ہم اور آپ فاسقوں اور فاجروں کے متولی بننے پر خاموشی اختیار کیے ہوئے ہیں تو

یہ مضمون پیام نو مورخہ ۹/۲/۱۹۹۰ء کی اشاعت میں شائع کیا جا چکا ہے

کیاہم کو حق ہے کہ ہم امام حسینؑ کا نام لیں؟ کیا امام حسینؑ ان فاسقوں اور فاجروں سے راضی ہوں گے؟

جس سماج میں سال بھر ذکر حسینؑ رہتا ہو وہاں آخر ایسا کیوں ہے؟ کیوں فاسقوں، فاجروں، شرابیوں، جواریوں، اوقاف کے لٹیروں اور لڑکیوں کی دلالی کرنے والوں کو سماج میں مقام حاصل ہے؟ کیوں یہاں کے علماء وذاکرین ان بے ایمانوں سے تعلقات بہتر سے بہتر بنانے میں لگے ہوئے ہیں؟ ہونا یہ چاہیے تھا کہ غلط افراد سے ترک تعلق کیا جاتا، ان کو پنپنے کا موقع نہ دیا جاتا۔ مگر افسوس! چاہے وہ بڑے خطیب ہوں یا چھوٹے، امام جمعہ وجماعت ہوں یا دینی مدرسوں کے سربراہ، یہ سب کے سب ان یزیدیوں کو پنپنے کا موقع دے رہے ہیں۔ یہ جاننے کے باوجود کہ فلاں وقف کی لاکھوں کی آراضی کا گھپلا ہو چکا ہے، کیوں ایک لفظ بھی مجلس میں نہیں کہتے؟ کیسے اوقاف کے دلالوں اور لٹیروں کے یہاں دعوت قبول کرتے ہیں؟ کچھ چہرے تو ہمارے یہاں ایسے ہیں کہ جن کو بچہ بچہ جانتا ہے کہ یہ وقف خور اور چار سو بیس ہیں۔ مگر پھر بھی ان چہروں کو آپ علماء و ذاکرین کے قریب اور منبر کے پاس پائیں گے۔ وہی علماء و ذاکرین جو قوم میں نفاق کو بڑھاوا دے رہے ہیں جو اپنی تقریروں اور اپنے وجود سے لوگوں کے ذہنوں میں زہر گھول رہے ہیں۔ کاش کہ لوگوں تک علم کی روشنی پہنچاتے، اوقاف کی تباہی اور اخلاقی برائیوں کی جانب متوجہ کرتے تو شاید قوم کی حالت بہتر ہوتی۔ آج اسی لکھنؤ کے کتنے شیعہ اوقاف کے ایسے

متولی ہیں کہ جو شراب پی کر کربلا یا امامباڑوں میں جانے سے کوئی عار نہیں محسوس کرتے ہیں۔

ہم نے ایک دفعہ میٹنگ میں یہی بات کہی تھی کہ آپ نے یہاں کے مقصد ذاکرین سے میرے بارے میں یہ تو سنا ہوگا کہ یہ دشمنِ اہل بیت ہیں۔ قوم کو گمراہ کر رہے ہیں۔ مگر کیا کسی کو اُس شخص کا نام بھی معلوم ہے جس نے حضرت گنج کے سبطین آباد امامباڑے کی تمام آراضی بیچ ڈالی اور بچی کھچی مسجد کو بھی سنّی وقف بورڈ میں اندراج کرا دیا؟ کبھی کسی ذاکر سے آپ نے اُس شخص کا نام سُنا؟ روضۂ زینبیہ کی کروڑوں روپئے کی آراضی غیروں کے قبضہ میں جا چکی ہے۔ یہی حال کربلائے عظیم اللہ خاں کا بھی ہے۔ بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ زیادہ تر شیعہ اوقاف کی یہی حالت ہے۔ تو کیا جائدادوں کو غصب کرنے اور لوٹنے والے محبانِ اہلِ بیتؑ ہیں؟ اور اس لوٹ کے خلاف کچھ کہنے کی ذمہ داری علماء و ذاکرین کی نہیں ہے؟ شیعہ وقف بورڈ کے بعض ایمان فروش ملازمین اور بے ایمان متولیوں نے ملی بھگت سے قوم کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا ہے اور پہنچا رہے ہیں۔ اور ہمارے زیادہ تر علماء و ذاکرین ان حرام خوروں کی بلاواسطہ یا بالواسطہ پشت پناہی کر کے "یزیدیت کے پروردگار" بنے ہوئے ہیں۔

ہم اپنی نحیف آواز ان کے کانوں تک پہنچا دینا چاہتے ہیں کہ شیعہ قوم مٹ رہی ہے، ختم ہو رہی ہے۔ خدا کے واسطے اب ہوش میں آئیے۔ کچھ تو آخرت کا خیال کیجیے۔ کچھ تو اللہ سے ڈریے۔ جب نہ پسر سعد رہا اور نہ حکومت رہے رہی تو آپ بھی ان یزیدیوں کی مدد کر کے کیا پائیں گے؟

احترام منبر سمینار

عزاداری کی دو قسمیں ہیں ــــ بامقصد عزاداری اور بے مقصد عزاداری۔ جیسا کہ آپ سب ہی جانتے ہیں کہ قید خانۂ شام سے رہا ہونے کے بعد جناب زینبؑ نے پہلا کام جو کیا وہ دمشق میں امام حسینؑ کی صفِ عزا کا اہتمام کرنا تھا یعنی عزاداریِ امام مظلوم کی بنیاد رکھی۔ مگر کم لوگ اس جانب توجہ دیتے ہیں کہ امام حسینؑ پر بے مصرف گریہ کرنے سے سب سے پہلے منع کرنے والی بھی جناب زینب ہی تھیں۔ بلکہ بے مصرف گریہ پر ٹوکنے کا کام جناب زینبؑ نے پہلے انجام دیا ہے۔ یاد کیجیے کوفے کے بازار کا وہ مجمع جو اسیروں کا تماشہ دیکھنے کے لیے اکٹھا ہوا تھا اور جب یہ معلوم ہو گیا کہ یہ کٹے ہوئے سر حسینؑ اور ان کے ساتھیوں کے ہیں، یہ قیدی عورتیں محمدؐ کی نواسیاں ہیں تو ایک کہرام مچ گیا، لوگ رونے لگے۔ ہونا یہ چاہیے تھا کہ مصیبت حسینؑ پر ان رونے والوں کو جناب زینبؑ جنت کی بشارت دیتیں، مجلسیں کرنے اور گریہ کے ثواب سے آگاہ کرتیں۔ مگر جو خطبہ آپ نے دیا اس کے ابتدائی جملے آپ ملاحظہ فرمائیں:

"کوفے والو! غدر و فریب کے پجاریو! رو رہے ہو، تمھارے یہ

یہ مضمون پیام تو مورخہ ۱۶ ار فروری ۱۹۹۰ء کی اشاعت میں شائع ہو چکا ہے۔

www.kitabmart.in

آنسو کبھی نہ خشک ہوں۔ ہمیشہ فریاد کرتے رہو۔ مکاری کے پتلو! تم تو اس عورت کی طرح سے ہو جو محنت سے اون کات کر اور پھر آپ ہی اُسے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتی تھی۔ قسمیں کھا کھا کر پلٹنے والو! کذب و غرور کے مجسّمو! لونڈیوں کی سی خوشامد اور دشمنوں کی طرح عیب جوئی کرتے ہو۔ ظالمو! تم گھورے پر کی اُگی ہوئی ہریالی اور جھوٹی ملمع کاری کی طرح بے قیمت ہو۔ کس بری طرح تم نے اپنی عاقبت خراب کی ہے۔ اب غضب الٰہی کے لیے تیار رہو۔ تم ہمیشہ عذاب میں مبتلا رہو گے۔ کیوں ستم گرو! آنسوؤں سے منھ دھو رہے ہو؟ ہاں روؤ، خوب روؤ، تم رونے کے مستحق ہو۔ ہنسنے سے زیادہ روؤ۔ تم نے اپنے دامن پر وہ دھبہ لگایا ہے جو دھوئے نہیں چھوٹے گا۔" (حوالہ: حضرت زینب کبریٰ کے خطبے' از علامہ ابن حسن نجفی ص۲۳)

ان جملوں کو آپ دوبارہ غور سے پڑھیے۔ یہ الفاظ نہیں ہیں بلکہ لعنت ہے جو جناب زینبؑ نے ان رونے والوں پر بھیجی ہے۔ تو کیا کوئی صاحب ایسے ہیں جو یہ کہہ سکیں کہ جن آنسوؤں پر جناب زینبؑ نے لعنت بھیجی ہے اُن آنسوؤں کے عوض جنت مل جائے گی؟ آپ سمجھ لیں کہ جن لوگوں سے جناب زینبؑ خطاب کر رہی تھیں اُن میں نہ تو شمر تھا اور نہ خولی، نہ ابن زیاد تھا نہ پسر سعد، بلکہ اُن کا خطاب کوفہ کے اُن عام شہریوں سے تھا جو آلِ رسول کی مصیبت پر آنسو بہا رہے تھے۔ جو اپنے گریہ سے جناب زینبؑ سے اظہار ہمدردی کر رہے تھے۔ آخر ایسا کیوں؟

اگر آپ غور کریں تو آپ کو معلوم ہو گا کہ یہ گریہ کرنے والے بے مقصد اور

بے مصرف گریہ کر رہے تھے۔ یہ مظلوم سے اظہار ہمدردی تو ضرور کر رہے تھے مگر خود اپنے پورے وجود سے ظالم کی تقویت کا باعث تھے۔ ان لوگوں نے یزید کی خلافت کو قبول کیا، ابن زیاد کی گورنری کے آگے گردنیں ڈال دیں۔ امام حسینؑ کی کوئی عملی مدد نہیں کی اور واقعۂ کربلا کے رونما ہونے کے باوجود ان میں شہادت کی تڑپ پیدا نہیں ہوئی۔ ایمان کی حرارت انھوں نے محسوس نہیں کی۔ ظالموں کی مخالفت اُنھوں نے اختیار نہیں کی۔ ظلم کے خلاف احتجاج نہیں کیا۔ ظالم حکّام کی غیر اسلامی روش کے خاموش تماشائی بنے رہے۔ جناب زینبؑ اپنی تقریر سے یہ واضح کر رہی تھیں کہ جس طرح کسی شخص کا محض زبان سے لَا اِلٰہ اِلَّا اللہ کہنا اُسے اس وقت تک کوئی فائدہ نہیں پہنچائے گا جب تک اپنے پورے وجود سے اللہ کی رضا کے آگے سرِ تسلیم خم نہ کر دے اُسی طرح محض مظلوم کی ہمدردی میں بہنے والے آنسو کوئی وقعت نہیں رکھتے جب تک کہ وہ آنسو بہانے والا ظلم کے خلاف میدان عمل میں نہ ڈٹ جائے۔ جب تک کہ خود اس میں بھی امام حسینؑ کی طرح دین کی پابندی اور نصرت حق کے لیے جہاد کی تڑپ نہ پیدا ہو جائے۔ جب تک احکامات الٰہی کی مخالفت کا کھلے عام ہونا اس کے لیے ناقابل برداشت تکلیف کی حیثیت نہ اختیار کر لے۔ جب تک کہ محافظتِ شریعت کی ذمہ داری کا احساس اُس میں نہ پیدا ہو جائے۔ جب تک کہ وہ اپنی اسیری گوارا کرنے کو تیار نہ ہو جائے۔ مگر کسی ظالم کے پنجہ میں اسلام کی اسیری اُسے گوارا نہ ہو۔

اس طرح جناب زینبؑ کا مطالبہ یہ ہے کہ لوگ بامقصد عزادار بنیں۔

ذکرِ حسینؑ لوگوں کی زندگیوں کو مقصدیت اور سمت و آگہی عطا کرنے کا ذریعہ بنے۔ اب اگر منبر سے ہونے والی تقاریر جنابِ زینبؑ کے اس مطالبہ کے تقاضوں کو پورا کرنے والی ہوگی تو بے شک عبادت قرار پائے گی اور اس کے مثبت نتائج اس معاشرہ میں ظاہر ہوں گے۔ لوگوں میں دین کے احترام کا جذبہ بیدار ہوگا۔ آپس میں اخوت اور بھائی چارگی کو فروغ ہوگا۔ احکامات الٰہی کی مکمل پابندی ہوگی۔ ہر فرد میں سنجیدگی، وقار اور ذمہ داری کا احساس پایا جائے گا یعنی وہ معاشرہ ایک مثالی معاشرہ اور دوسروں کے لیے نمونۂ عمل ہوگا۔ ایسے سماج میں جھوٹ، نفاق، بدی، غیبت، تہمت و بہتان تراشی، حسد، ریاکاری، بے ایمانی اور ظلم کو پنپنے کا موقع نہیں ملے گا۔ یہ صورت حال خود ہی اعلان کرے گی کہ اس معاشرہ میں منبر کا احترام کیا جا رہا ہے، ذکرِ حسینؑ کا حق ادا ہو رہا ہے۔

بدقسمتی سے موجودہ صورت حال اس کے برعکس ہے۔ ہر صاحبِ فکر اور باشعور انسان شدت سے اس بات کو محسوس کر رہا ہے کہ آج ذاکرین اور خطباء کی اکثریت اپنے فرائض و ذمہ داری سے غافل ہو گئی ہے۔ ایسی تقاریر ہو رہی ہیں جن سے منبر کی حرمت پامال ہو رہی ہے۔ معاشرہ کو سمت و آگہی عطا ہونے کے بجائے افراتفری کا ماحول ہے۔ اخوت اور بھائی چارگی کے بجائے اختلاف بین المسلمین اور نفاق بین المومنین کو بڑھاوا مل رہا ہے۔ احکامات الٰہی کا کھلم کھلا مضحکہ اڑایا جا رہا ہے۔ حد یہ ہے کہ خود منبروں سے واجبات الٰہی کی نفی کی جا رہی ہے۔ جھوٹی روایات اور قرآنی آیات کی گمراہ کن تاویلات کی جا رہی ہیں۔ اخلاق رذیلہ کے حامل افراد کو سماج میں مقام

حاصل ہوگیا ہے۔ بامقصد عزاداری اور بے مقصد گریہ کی تفریق ختم ہو جانے کی وجہ سے فالتو بحثوں کو منبروں سے چھیڑا جا رہا ہے۔

ہم لوگ اس بات کو محسوس کرتے ہیں کہ موجودہ روش امام حسینؑ سے غداری کے مترادف ہے۔ لہٰذا قوم کے ارباب فکر کی یہ ذمہ داری ہے کہ اس صورت حال کا تجزیہ کریں اور قوم کے سامنے ایک مثبت لائحہ عمل پیش کریں۔ شہر لکھنؤ کو اس برصغیر ہند و پاک میں شیعی نقطہ نظر سے آج بھی ایک مرکزی حیثیت حاصل ہے اور یہاں ہونے والی بات کی بازگشت اس پورے خطۂ ارض میں سنی جاتی ہے۔ لہٰذا قومی مسئلہ پر گفتگو کے لیے بہترین جگہ یہی ہے۔

۲۳، ۲۴، و ۲۵، مارچ ۱۹۹۰ء کو شہر لکھنؤ میں کل ہند احترام منبر سمینار منعقد کیا جا رہا ہے۔ اس سلسلے میں دعوت نامے اور پوسٹر جاری کیے جا رہے ہیں۔ آپ سے گزارش ہے کہ آپ اس بات کو اپنے ساتھیوں اور اعزا تک بھی پہنچائیں اگر آپ خود کسی عنوان پر مختصر مضمون یا مقالہ تحریر فرمائیں اور اس سمینار میں شرکت فرمائیں تو بہت مناسب ہوگا ورنہ کم از کم اپنے حلقۂ اثر میں ضرور احترام منبر کی اہمیت کی طرف لوگوں کو متوجہ فرمائیں۔

وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰی

عقیدہ اور معاملات

گذشتہ مضمون میں عرض کیا کہ عزاداری کی دو قسمیں ہیں۔ ایک بامقصد عزاداری اور دوسرے بے مقصد عزاداری۔

ہماری قوم امام حسین علیہ السلام کی عزاداری کرتی ہے۔ خاص طور پر لکھنؤ تو مرکزِ عزاداری ہے لیکن ہم کس قسم کی عزاداری کرتے ہیں؟ کیا ہم بامقصد عزاداری کر رہے ہیں۔ جو موجب اجر و ثواب ہے اور جس کے نتیجہ میں دنیا و آخرت کی فلاح و کامیابی حاصل ہوتی ہے یا یہ کہ ہم بے مصرف گریہ میں مشغول ہیں کہ جو روح کربلا سے عاری ہے اور جس کے برے نتائج ہماری پوری معاشرتی زندگی سے عیاں ہیں۔

ہمارے اوقاف کی تباہ حالی اور اس تباہی کے ذمہ داروں کو سماج میں مقام حاصل ہونا اس کا بیّن ثبوت ہیں۔ آپ شہر کی کربلاؤں، درگاہوں اور امام باڑوں کا ایک جائزہ لیں۔ شیعہ وقف بورڈ اور حسین آباد ٹرسٹ کی کارکردگی پر ایک نگاہ ڈالیے۔ آپ کو خود حالات کا بخوبی علم ہو جائے گا۔ وہی متولی ایک طرف آپ کو نامِ حسینؑ پر وقف کی جانے والی لاکھوں کی جائداد کو معمولی قیمت پر فروخت کرتا ہوا ملے گا تو دوسری طرف وہی وقف خور کسی یوم غم یا محفل اور مقاصدہ کا انتظام کرتا ہوا ملے گا کہ بغیر لفظ "چار سو بیس" یا "جعلیا" لفظ

یہ مضمون پیام نو مورخہ ۲۳ فروری ۱۹۹۰ء کی اشاعت میں شائع ہو چکا ہے

کا اضافہ کیسے ہوئے اس کا نام عرف عام میں مکمل نہیں ہوتا۔ مگر دوسری طرف وہی آپ کو عید غدیر کی محفل کا بانی مبانی ملے گا۔ علمار، خطبار اور ذاکرین اس کے قریب ملیں گے، مجالس و محافل میں سب سے آگے سب سے زیادہ تعریفیں کرنے والا وہی آپ کو ملے گا۔

یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ جتنا زیادہ ہمارے یہاں مجالس، محافل میں اضافہ ہو رہا ہے اتنا ہی زیادہ ہمارے یہاں جھوٹ، بے ایمانی اور نفاق میں اضافہ ہو رہا ہے۔ آدمی اس طرح جھوٹ بولتا اور جھوٹ پر آنکھ بند کر کے یقین کر لیتا ہے جس کی مثال کسی بھی قوم یا کسی بھی مذہب میں نہیں ملے گی۔ یہ تو محض ایک پہلو ہے۔ جب کسی قوم میں جھوٹ پنپتا ہے تو باقی تمام اخلاقی برائیاں اپنے آپ پھیل جاتی ہیں۔ بدکرداری کا دور دورہ ہو جاتا ہے۔

بطور عبرت ایک واقعہ عرض ہے۔ تقریباً تین سال قبل میرا حج کے لیے جانا ہوا تھا۔ میرا واپسی کا ٹکٹ او۔کے نہیں تھا۔ مدینہ میں ایک ٹریولنگ ایجنسی کے دفتر میں میں ٹکٹ او۔کے۔ کرانے کے لیے گیا۔ اتفاق سے ٹریولنگ ایجنسی والے ہندوستانی تھے، لکھنؤ کے تھے اور شیعہ تھے۔ جب گفتگو ہوئی تو معلوم ہوا کہ وہ میرے ایک قریبی دوست کے عزیز ہیں۔ انھوں نے مجھے دوسرے دن کھانے پر مدعو کیا۔ کھانے کے دوران شیعان لکھنؤ کی حالت کا ذکر ہونے لگا۔ اُس وقت اُن صاحب نے فرمایا کہ "جاوید بھائی! آپ یقین مانیے کہ یہاں یہ بتاتے ہوئے شرم آتی ہے کہ میں لکھنؤ کا رہنے والا ہوں یہاں کے شیخوں کو ہمارے محلوں تک کے نام معلوم ہیں کیوں کہ وہاں کی

لڑکیاں ان کو سپلائی ہوتی ہیں۔"

آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم پوری سنجیدگی کے ساتھ خود اپنے نفس کا محاسبہ کریں۔ دنیا کی کون سی قوم ایسی ہے جو اپنے کو غلط سمجھتی ہے؟ دنیا کا کون سا مذہب ایسا ہے جس کے ماننے والے اپنے عقائد کو غلط مانتے ہیں؟ ہر شخص اپنے کو حق پر اور خوش عقیدہ مانتا ہے۔ پھر حق و باطل کی پرکھ کیسے ہوگی؟ اصل کسوٹی یہ ہے کہ نہ تو پرکھ عقیدہ سے ہوگی اور نہ ہی عبادات سے ہوگی۔ بلکہ اُس کی پرکھ "معاملات" سے ہوگی۔ آدمی معاملات میں کیسا ہے؟ وعدہ خلافی کرتا ہے یا یہ کہ وعدہ کا پکا ہے۔ امانت کی حفاظت کرتا ہے امانتدار ہے یا یہ کہ دھوکہ باز اور لے مار ہے۔ سچ بولتا ہے یا جھوٹا ہے۔ زبان اور گفتگو درست ہے یا یہ کہ گالم گلوج اس کا شعار ہے؟ لوگوں کے ساتھ ہمدردی اور رحم دلی کا برتاؤ کرتا ہے یا کہ شقی القلب ہے؟ منکسر المزاج ہے یا مغرور ہے؟ شریف آدمیوں اور سچّوں کے ساتھ رہتا ہے یا یہ کہ جھوٹے اور بے ہودہ لوگوں کی صحبت میں اٹھتا بیٹھتا ہے؟ حرام اور حلال کی اس میں کچھ تمیز ہے یا نہیں۔

اب جو شخص معاملات میں غلط ہے تو اس کا عقیدہ بھی غلط ہوگا جس طرح کبھی کبھی چور اور گرہ کٹ یہ ہتھکنڈہ استعمال کرتے ہیں کہ جب لوگ ان کو دوڑاتے ہیں اور یہ خدشہ ہوتا ہے کہ وہ پکڑ لیے جائیں گے تو وہ خود ہی بھاگتے ہوئے چور، چور چلانے لگتے ہیں تاکہ لوگ یہ سمجھیں کہ چور کوئی اور ہے اور یہ خود چور کا پیچھا کر رہے ہیں۔ یہی حالت ہمارے یہاں کے مفسد ذاکرین بے ایمان

متولیوں اور وقف بورڈ کے ایمان فروش ملازمین کی بھی ہے۔ یہ اپنی غلطیوں سے عوام کی توجہ ہٹانے کے لیے بس دوسرے کو بدعقیدہ، وہابی ایجنٹ اور دشمن اہل بیت کا نام دے کر چیخنا چلانا شروع کر دیتے ہیں تاکہ عوام کی توجہ خود ان کے کالے کرتوتوں سے ہٹی رہے۔

میں اس بات کو واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ یہاں کے بے عمل علماء اور مفسد ذاکرین جس روش پر قوم کو چلانا چاہ رہے ہیں اس کا کوئی تعلق سیرتِ معصومینؑ سے نہیں ہے۔ ورنہ جو قوم معصومین کی روش اپنائے گی تو اس میں جھوٹ، بدی، غیبت، تہمت تراشی، بے ایمانی، گالم گلوچ، جوا، لاٹری، شراب نوشی، عصمت فروشی، جہالت، غرور، نفاق کے لیے کوئی مقام نہیں ہوگا۔ وہ قوم ایک زندہ، باوقار اور سربلند قوم ہوگی۔ اس کے مذہبی حقوق کوئی چھیننے والا نہ ہوگا۔ اس کی عبادت گاہوں سے زندگی کے آثار نمایاں ہوں گے۔ اس قوم کے افراد کو دیگر اقوام کے لوگ لائق بھروسہ اور قابل اعتماد جانیں گے۔

آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم سب مل کر موجودہ صورت حال پر غور کریں، جو اسباب تنزلی ہیں ان کا تجزیہ کریں، اصلاحِ حال کریں اور مستقبل کی بہتری کے لیے حصول علم اور سیرت معصومینؑ سے آگاہی حاصل کریں۔ وہ کیسے عبادت کرتے تھے، وہ کیسے غم حسین مناتے تھے، وہ کیسے اپنے پیش رو افراد کی ولادت کی تاریخوں پر جشن مناتے تھے، وہ کیوں کر غدیر کی محفل کا جشن مناتے تھے، وہ لوگوں سے کیسے پیش آتے تھے۔ اگر کسی میں عقیدہ و عمل کی کمزوری پاتے تھے تو اس پر کس طرح لعنت بھیجتے تھے یا کس طرح اُس کی

اصلاح کرتے تھے ۔ ائمۂ معصومینؑ کس طرح تبرا کرتے تھے یا کس طرح ۹ ربیع الاول کی محفل کرتے ۔ عشرہ اور چہلم کو اُن کا کیا دستور تھا ۔ بغیر یہ سب جانے ہوئے ہم کیونکر معصومین کی پیروی کر سکتے ہیں ؟

جب ہم ان تمام باتوں پر غور کریں گے تو اپنے آپ ہم کو اصلاح ذاکری اور احترام منبر کی طرف متوجہ ہونا پڑے گا ۔ ہم کو جھوٹی واہ واہی اور سچی پیروی میں فرق کرنا پڑے گا ۔ ہم کو علمی تقاریر اور جاہلانہ چرب زبانیوں میں امتیاز کرنا ہی پڑے گا ۔ ہم کو اندھی تقلید اور دین فہمی میں کیا فرق ہے یہ محسوس کرنا ہوگا ۔ ورنہ ہم یوں ہی کاروانِ شیعیت کو ان رہزنوں کے ہاتھوں لٹتے اور تباہ ہوتے دیکھتے رہیں گے اور اپنی بے وقوفی سے ان کو رہبر سمجھ کر ان کی پذیرائی کرتے رہیں گے ۔

بُت شکنی

بُت شکنی صرف مٹی یا پتھر کے بتوں کے توڑنے کا نام نہیں ہے۔ مٹی یا پتھر کا بُت جس طرح ایک آدمی تراش سکتا ہے اسی طرح ایک آدمی توڑ بھی سکتا ہے۔ ایک قوی ارادہ اور ایک بھرپور وار کسی بھی مضبوط سے مضبوط پتھر کے بُت کا کام تمام کر سکتے ہیں۔ ان مادی بتوں کے مقابلہ میں باطل عقائد، فرسودہ رسومات اور غلط عادتوں کے بت چونکہ برسوں اور صدیوں کے اجتماعی انحراف کا نتیجہ ہوتے ہیں لہٰذا ایک وار میں ان کا ٹوٹنا مشکل ہوتا ہے اور اس کے لیے پیہم اور پے در پے واروں کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب باطل عقائد یا فرسودہ رسوم کی اصلاح کے لیے کوئی بات کہی جاتی ہے تو لوگوں کی اکثریت اس کی مخالفت کرتی ہے کیونکہ یہ معاملہ ایک غلط بات کو غلط ماننا ہی نہیں ہوتا ہے بلکہ اپنے آبا و اجداد کی غلطیوں کا اعتراف کرنا بھی ہوتا ہے۔ اپنے آبا و اجداد کو غلط تسلیم کرنے کے لیے عام انسان آسانی کے ساتھ تیار نہیں ہوتا ہے اور ہٹ دھرمی اختیار کرتا ہے۔ چنانچہ جب بھی اصلاح معاشرہ کے لیے کوئی بات کہی جاتی ہے تو اس معاشرے کے افراد بغیر بات کو تولے اور سمجھے ہوئے مختلف انداز میں مخالفت کرتے ہیں۔ کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ کیا ہمارے بزرگ

یہ مضمون پیام نو مورخہ ۲ مارچ ۱۹۹۰ء کی اشاعت میں شائع کیا جا چکا ہے

بیوقوف یا غلط تھے؟ کبھی کہا جاتا ہے کہ کیا ہمارے علماء جو گذر چکے وہ جاہل تھے؟ اور اگر کہیں اصلاح کی گفتگو کرنے والا خود کسی علمی خانوادہ کی فرد ہوا تو فوراً اس کے باپ دادا وغیرہ کا نام لے کر کہا جائے گا کہ کیا یہ اُن سے زیادہ قابل ہیں اور کیا وہ لوگ غلط تھے؟

اس طرح کی باتیں اگر کسی غیر مسلم معاشرہ کے افراد اپنی غلط روش پر اصرار کرنے کے لیے بطور دلیل کہیں تب بھی قابل معافی نہ ہوں گے چہ جائیکہ وہ لوگ اس طرح کی باتیں کہیں جو کہ اپنے کو قرآن اور اہل بیت سے وابستہ کرنے کا دم بھرتے ہوں کیونکہ قرآن اور احادیث میں اس طرح کی ہٹ دھرمی کی سختی سے تکذیب کی گئی ہے۔

اگر کوئی معاشرہ اصلاح کو قبول نہیں کرے گا تو اس پر جمود طاری ہو جائے گا اور وہ تباہ ہو جائے گا۔ اس لیے کہ زمانہ تو اپنی رفتار سے چلے گا ہی۔ تاریخ کا کارواں آگے بڑھتا رہتا ہے۔ جن قوموں پر جمود طاری ہو جاتا ہے وہ پیچھے رہ جاتی ہیں اور آگے آنے والی قومیں ان کو روندتی ہوئی آگے بڑھ جاتی ہیں۔

جس طرح اگر کوئی شخص کھانے میں بدپرہیزی کرے گا تو اس کو بدہضمی ہو جائے گی۔ اسی طرح غیر شرعی رسومات اختیار کرنے سے معاشرتی بیماری پیدا ہوتی ہے جس کے برے نتائج جلد یا بدیر بھگتنا ہی پڑتے ہیں۔

مثال کے طور پر آج ہمارے معاشرہ میں یہ بات پوری طرح ظاہر ہو چکی ہے کہ لڑکیوں کی شادی ایک بہت بڑا مسئلہ ہے۔ اوّل تو رشتہ ملنا ہی مشکل ہوتا ہے اور جب رشتہ ہو بھی جائے تو ایک ہی شادی کرنے میں لڑکی

کا باپ اَدھ مَرا ہو جاتا ہے۔ اب عالم یہ ہے کہ لڑکی پیدا ہونے کی خبر ملنے پر ہی ابا جان کے چہرے کی رونق اُڑ جاتی ہے۔ یہ صورت حال وہی ہے جس کی نشان دہی قرآن کریم کافروں میں کرتا ہے اور کہتا ہے کہ جب ان کو لڑکی ہونے کی خبر دی جاتی ہے تو اُن کے چہرے سیاہ پڑ جاتے ہیں گویا کہ ایک بڑی مصیبت آپڑی ہے۔ آخر یہ کافروں کی علامت اُن لوگوں میں کیسے پائی جاتی ہے کہ جو اہل بیت سے اپنے کو وابستہ کرتے ہیں؟ اس کا سیدھا جواب یہ ہے کہ کیونکہ نام تو اہل بیت کا لے رہے ہیں مگر اتباع کافروں کا کر رہے ہیں۔ اگر شادی بیاہ میں ہم یہاں کے غیر مسلموں کی نقالی کرنے کے بجائے یہ دیکھتے کہ رسول اکرمؐ کی شادیاں کس طرح ہوئیں۔ حضرت علی علیہ السلام نے کس طرح شادیاں کیں اور کس طرح ائمہ طاہرین علیہم السلام کی شادیاں ہوئیں اور ان کو مثالی نمونہ بناتے تو یقیناً ہمارے یہاں بھی لڑکی کی شادی ایک مقدس فریضہ کی ادائیگی اور عبادت ہوتی اور جس طرح عبادت انسان کے لیے بوجھ نہیں بنتی ہے بلکہ جسم و روح دونوں کی پاکیزگی کا ذریعہ بنتی ہے اسی طرح شادی بھی عبادت ہوتی ہے اور معاشرے کی پاکیزگی اور اطمینان کا ذریعہ بنتی ہے۔

ہمارے کون کون سے امام مانجھے بیٹھے تھے؟ اور کس کس امام کے اُبٹن ملا گیا تھا؟ ہمارے کتنے اماموں کے سر پر پگڑی اور سہرا باندھا گیا تھا اور بہنوئیوں کو کیا سہرا بندھوائی دی تھی؟ ہمارے کتنے اماموں کے یہاں رت جگا ہوا تھا' گلگلے پکے تھے، ڈھولک بجی تھی، گانے گائے گئے تھے۔

ہمارے کتنے اماموں نے جہیز کا مطالبہ کیا تھا اور نقدی مانگی۔ ہمارے کتنے

اماموں نے براتیوں کے لیے اچھے ناشتے اور عمدہ کھانے کا مطالبہ کیا تھا؟ اور اگر کھانا کھلانے میں کوئی کمی رہ گئی تو اُس کے طعنے دیے تھے ؟

ہمارے کتنے اماموں نے آرسی مصحف کی رسم ادا کی تھی اور اپنی دلہنوں سے کہا تھا کہ "بیوی آنکھیں کھولو میں تمہارا غلام ہوں"!

ہمارے کتنے امام نکاح کے بعد نا محرم عورتوں کے درمیان بٹھائے گئے تھے اور ان سے بے ہودہ قسم کے ہنسی مذاق کیے گئے تھے ؟

ہمارے کتنے اماموں نے چوتھی کھیلی تھی اور کھانا کھانے سے پہلے کچھ مطالبات کی شرط رکھی تھی کہ جب تک یہ مانگ پوری نہ ہوگی ہم کھانا نہیں کھائیں گے ۔ ہمارے کتنے اماموں کے چالے ہوئے تھے ؟

آپ ان سوالات کا جب جواب تلاش کریں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ان تمام باتوں کا، ان ڈھکوسلوں کا سیرت معصومینؑ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ مگر چونکہ ہم نے ان خرافات باتوں کو اس طرح اپنا لیا ہے کہ اس کو دین قرار دے لیا ہے اسی لیے آج شادی عبادت نہ ہوکر زحمت اور بوجھ بن گئی ہے ۔

اللہ کا شکر ہے کہ اس نے ہمارے عزیز دوست اور رفیق کار جناب عون نقوی صاحب کی توفیقات کو بلند فرمایا کہ انھوں نے شادی بیاہ کی رسومات کے بُت پر ایک آہنی ضرب سے اس طرح وار کیا کہ جو ہماری قوم کے نوجوانوں کے لیے مثالی نمونہ ہے ۔

۲۳ فروری ۱۹۹۰ء بروز جمعہ یہ مثالی شادی ہوئی ۔ جناب عون نقوی صاحب نے سہرا بھی نہیں باندھا اور نہ ہی کوئی مخصوص لباس زیب تن کیا بلکہ عام لباس

میں ہی رہے۔ ہم سب لکھنؤ سے نصیر آباد کے لیے روانہ ہوئے۔ راستے میں دعائیں اور آیات قرآنی کی تلاوت ہوتی رہی۔ نصیر آباد پہنچ کر دعائے وحدت پڑھی گئی۔ نماز بجماعت ادا ہوئی۔ لڑکی والوں نے مہمانوں کو چائے پلائی اس کے بعد وہاں کے ایک امام باڑہ میں جو "چوپار" کے نام سے مشہور ہے نکاح ہوا نکاح کے بعد ایس۔ آئی۔ ایم سے تعلق رکھنے والے جناب عبدالرحمٰن صاحب نے ایک مختصر مگر جامع تقریر نکاح اور بے جا رسوم سے متعلق کی۔ اُس کے بعد مجھے بھی کچھ کہنے کا شرف حاصل ہوا۔ برات میں آئے ہوئے میرے ساتھی اور خوش فکر شاعر جناب شکیل شمسی صاحب نے لکھنؤ سے نصیر آباد کے سفر کے دوران "بن پھول کے سہرے" کے کچھ اشعار نظم کر لیے تھے جو انھوں نے میری تقریر کے بعد سنائے۔ اور اس طرح یہ مختصر، سادی اور پُر اثر تقریب انجام پاگئی۔ پوری سنجیدگی کا ماحول تھا۔ جس طرح کسی بھی حقیقی عبادت میں ایک وقار پایا جاتا ہے وہ وقار وہاں تھا۔ کتنی ہی آنکھیں اس روحانی تقریب سے نم ہوگئیں اور کتنے ہی بزرگوں نے کہا کہ انشاء اللہ ہم بھی اپنے لڑکے کی شادی اسی طرح کریں گے۔

نکاح کے بعد لڑکی والوں نے اپنے مہمانوں کو کھانا پیش کیا۔ کھانے کے بعد بغیر کسی قسم کی رسموں کی ادائیگی کے رخصتی ہوئی۔ دولھا اور براتی حسینی ترانہ گاتے ہوئے واپس آئے۔ راستے میں رائے بریلی سے تھوڑا پہلے مغرب کا وقت آجانے پر ایک مسجد میں نماز جماعت ادا کی گئی جس کی امامت جناب عبدالرحمٰن صاحب نے فرمائی۔ اس طرح اتحاد اسلامی کا مظاہرہ ہوا۔

اس شادی میں اس بات کا پورا لحاظ رکھا گیا کہ لڑکی والوں کو کوئی زحمت

نہ ہو۔ چنانچہ بجائے رات کے وقت نکاح رکھنے کے دن کا وقت منتخب کیا گیا تاکہ لڑکی والوں پر فالتو مہمان داری کا بوجھ نہ پڑنے پائے۔

اس طرح لائق مبارکباد ہیں جناب عون نقوی صاحب اور ان کے خاندان کے بزرگ اور لائق مبارکباد ہیں جناب سید حیدر عباس رضوی صاحب کہ جو دلہن کے والد ہیں کہ انھوں نے مکمل تعاون فرمایا اور فرسودہ رسومات کے بُت پر کاری ضرب لگا کر بُت شکنی فرمائی۔

ہم تمام مومنین کرام سے گذارش کرتے ہیں کہ وہ بارگاہ ربّ العزّت میں دعا کریں کہ جناب عون نقوی صاحب اور ان کی اہلیہ ایک پر مسرت ازدواجی زندگی گذاریں اور ایک ایسے خانوادہ کی تشکیل عمل میں آئے جو خالص اسلامی ہو۔ آمین

کل کی خبر

قومی جائدادوں کی لوٹ اور تباہی پر ہم نے بارہا تبصرہ کیا ہے مگر آج ہم آپ کو جس بات کی خبر دینے جا رہے ہیں وہ یقیناً نہ یہ کہ افسوسناک ہے بلکہ دل خراش بھی ہے۔

آپ کے علم میں ہوگا کہ مدرسۃ الواعظین کے نام سے ایک مدرسہ شیعیت کی تبلیغ و ترویج کے لیے قائم کیا گیا تھا جس کا کام واعظین کی تربیت کرنا تھا تاکہ یہ واعظین دیگر مذاہب کے مقابلہ میں اسلام اور شیعیت کی حقّانیت ثابت کریں اور دین کی تبلیغ کریں۔ لیکن آج یہی مدرسۃ الواعظین شیعیت کا قبرستان بننے جا رہا ہے۔

اس مدرسہ کے باہری حصہ میں الواعظ پریس قائم ہے۔ آج یہ پریس غیر مسلمین کے ہاتھ میں چلا گیا ہے اور اگر افراد ملّت متوجہ نہ ہوئے تو کل اس پریس کے ساتھ ساتھ اس قدیمی ادارہ سے بھی ہاتھ دھونا پڑے گا۔

ہمارے تمام قدیمی ادارے مفلوج یا مردہ ہو چکے ہیں۔ افسوس اس بات کا ہے کہ جن لوگوں کی ذمہ داری یہ بنتی تھی کہ وہ اصلاح قوم کے لیے جی جان سے جٹ جائیں وہی لوگ افراد ملّت کی توجہ ہٹانے کے لیے فالتو بحثیں چھیڑتے

یہ مضمون پیام نو مورخہ ۹ / مارچ ۱۹۹۰ء کی اشاعت میں شائع کیا جا چکا ہے

ہیں: اسی پیام نو میں ایک مراسلہ شائع ہوا ہے جس میں حدیث کساء کے بارے میں ایک ذاکر کی بات نقل کی گئی ہے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ اسی ۲۸ ر رجب کو کربلائے دیانت الدولہ میں جو سالانہ مجلس امام حسینؑ کے سفر غربت کی یاد میں منعقد ہوئی اس میں بھی ذاکر نے حدیث کساء اور دعائے کمیل کی بحث چھیڑی تھی جب کہ اس پورے ہندوستان میں ایک شخص کا نام وہ ذاکر صاحب نہیں بتا سکتے ہیں کہ جس نے یہ بات کہی ہو کہ حدیث کساء پڑھنا بیکار ہے، حدیث کساء کے بدلے دعائے کمیل پڑھو۔

بہر حال ابھی چاہے ان مفسد ذاکرین کی سمجھ میں آیا ہو یا نہ آیا ہو لیکن بحمد اللہ قوم میں اصلاح ذاکری کے تئیں بیداری پیدا ہو گئی ہے۔

احترام منبر سمینار کا خیر مقدم جس انداز سے سماج کے مختلف طبقوں سے تعلق رکھنے والے افراد نے کیا ہے اُس سے ہم سب کی کافی ہمت افزائی ہوئی ہے۔ تقریباً ہر شخص نے یہی کہا کہ یہ سمینار اس وقت کی اہم ضرورت ہے۔

۲۶ ر و ۲۷ ر فروری کو میرا علی گڑھ جانا ہوا تھا۔ وہاں جس کو بھی میں نے احترام منبر سمینار کے انعقاد کی خبر دی اس نے یہی کہا کہ آپ لوگ جو قدم اٹھا رہے ہیں وہ وقت کا تقاضہ ہے۔ ذاکری کے گرتے ہوئے معیار کو بہتر بنانے کے لیے یقیناً اجتماعی پیمانے پر کوشش ہونی چاہیے۔ ان ہی تاثرات کا اظہار ان خطوط سے بھی ہو رہا ہے جو سمینار کے دعوت ناموں کی وصولیابی کے بعد مومنین کرام نے بھیجنا شروع کیے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا لاکھ شکر ہے کہ اُس نے ہماری نحیف آواز میں یہ اثر پیدا

کیا کہ پورے ہندوستان سے اس آواز پر "لبیک" کہی جا رہی ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ ۲۳ مارچ سے شروع ہونے والا احترام منبر سمینار انشاء اللہ تاریخ شیعیت میں ایک انقلابی اہمیت کا حامل ہوگا۔ آمین۔

تعاون کے اُصول

جیسا کہ آپ حضرات کے علم میں ہے، زیادہ تر شیعہ اوقاف متولیوں کی بے ایمانی یا بدانتظامی کی بدولت تباہ ہو رہے ہیں۔ کیونکہ زمینوں کی قیمت بہت بڑھ رہی ہے لہٰذا ان لوگوں کی چاندی ہو گئی۔ اپنی ساکھ بنانے کے لیے انھوں نے طریقہ یہ اختیار کیا ہے کہ بے ایمانی کے ذریعہ حاصل کی ہوئی رقم کا ایک حصّہ یہ لوگ محافل یا مجالس منعقد کرنے میں صرف کر دیتے ہیں۔ اس طرح اپنی بے ایمانی کو دین داری کا جامہ پہنا دیتے ہیں۔ دوسری طرف کیونکہ ذاکرین کا مفاد ان سے وابستہ ہوتا ہے لہٰذا بجائے اس کے کہ لوگوں کو حقائق سے باخبر کریں، ذاکرین عوام کے سامنے فالتو بحثیں چھیڑ کر لوگوں کی توجہ اصل مسائل کی طرف نہیں آنے دیتے ہیں۔

پیامِ نو میں علماء و ذاکرین کی اس غلط روش پر کئی دفعہ تنقید کی گئی وہ بے ایمان متوّلیوں اور وقف بورڈ کے بعض اہل کاروں اور ذمہ داروں کی وقف خوریوں پر کیوں خاموش ہیں اور بجائے ان بے ایمانوں کی مخالفت کرنے کے ان کے ساتھ رہتے ہیں اور اس طرح ان وقف خوروں کی ہمّت افزائی ہوتی ہے۔

یہ مضمون پیام نو مورخہ ۱۶ مارچ ۱۹۹۰ء کی اشاعت میں شائع کیا جا چکا ہے

بے ایمانوں کا ساتھ دینے کے جواز میں ایک عالمِ دین نے فرمایا کہ نیک کام میں تعاون کرنا چاہیے اگرچہ مشرک ہی کیوں نہ ہو (یعنی جب نیک کام میں مشرک کے ساتھ بھی تعاون کرنا چاہیے تو پھر یہ بے چارے وقف خور تو ماشاءاللہ شیعہ مومن ہیں) اپنے موقف کو صحیح ثابت کرنے کے لیے انھوں نے سورہ مائدہ کی آیت ۲ کا حوالہ دیا جس میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْا م وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ص

"اور کسی قبیلہ کی یہ عداوت کہ تمھیں ان لوگوں نے خانہ کعبہ (میں جانے) سے روکا تھا اس جرم میں نہ پھنسوا دے کہ تم زیادتی کرنے لگو۔ اور (تمھارا فرض یہ ہے کہ) نیکی اور پرہیزگاری میں ایک دوسرے کی مدد کیا کرو اور گناہ و زیادتی میں ایک دوسرے کی مدد نہ کرو۔"

اس آیہ کریمہ کا شان نزول مفسرین نے یہ بتایا ہے کہ مسلمانوں کے کچھ اونٹ مشرکوں نے چھین لیے تھے۔ پھر جب یہی مشرک حج کے موقع پر قربانی کے لیے وہی اونٹ لیے جا رہے تھے تو مسلمانوں نے رسول اکرمؐ سے اس خواہش کا اظہار کیا کہ ہمیں اس بات کی اجازت دی جائے کہ ہم اپنے اونٹ ان مشرکوں سے چھین لیں اس پر یہ آیت آئی جس کے مطابق اونٹ چھیننے کی اجازت نہیں دی گئی۔

اس سے ان عالم دین نے یہ نتیجہ نکالا کہ ہم کو کسی کی بے ایمانی، ایمانداری سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ ہم بس اُس کا نیک عمل میں ساتھ دیں گے۔ اب یہاں

ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر کسی شخص نے ایک وقف کی جائداد کو تباہ کر کے ایک لاکھ روپیہ حاصل کیا اور اس میں سے دس ہزار روپیہ خرچ کر کے کسی محفل، مجلس یا یومِ غم کا انعقاد کر رہا ہے تو کیا اس آیۂ کریمہ کی رو سے ہم اس ایک لاکھ کی لوٹ سے چشم پوشی اختیار کر کے اس کے پروگراموں میں شرکت کریں گے؟ کیا اُس کا غلط طریقہ سے حاصل کی گئی رقم سے مجلس یا محفل کرنا نیکی قرار پائے گا اور کیا ہمارا اُس شخص کے ساتھ تعاون کرنا "تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى" پر عمل پیرا ہونا قرار پائے گا؟

اس سوال کا جواب آپ خود آسانی کے ساتھ دے سکتے ہیں بشرطیکہ مندرجہ ذیل نکات آپ کے پیش نظر رہیں:

۱۔ سورۂ مائدہ کی یہ آیت ۱۰ھ میں نازل ہوئی جبکہ اُس سے ایک سال پہلے سورۂ توبہ کی آیات ۹ھ میں نازل ہو چکی تھیں جن کے ذریعہ مشرکوں کو حج میں آنے سے روکا جا چکا تھا۔ لہٰذا یہ دلیل پیش کرنا کہ حج ایک نیک عمل ہے اس میں تعاون کرنا چاہیے تو پھر اللہ نے کیوں منع کیا؟

۲۔ درحقیقت مفسرین کے مطابق اونٹ لے کر حج کو جانے والے مسلمان تھے جنھوں نے پہلے اپنے مشرکانہ دور میں مسلمانوں کے اونٹ چھین لیے تھے مگر بعد میں خود اسلام قبول کر لیا تھا۔

۳۔ رسول کے ساتھ کے مسلمانوں کو جو اونٹ واپس لینے سے منع کیا گیا اُس کے دو پہلو اور ہمارے پیش نظر رہنا چاہئیں:

(الف) حج میں جھگڑا فساد منع ہے لہٰذا ان مسلمانوں کو جھگڑا کرنے سے منع کیا گیا۔

(ب) کیونکہ اونٹ چھیننے والے اب دائرہ اسلام میں داخل ہو چکے تھے لہٰذا پہلے واقعات کی بنا پر اب بھی دل میں تنگی اور رنجش رکھنا مناسب نہ تھا اس لیے رسول کے ساتھیوں کو ذاتی مفاد پر اسلام کے وسیع تر مفاد کو ترجیح دیتے ہوئے جھگڑا نہ کرنا چاہیے تھا اس لیے زیادتی کرنے سے منع کیا گیا۔

۴۔ وقف خور حضرات جو ناجائز آمدنی میں سے ایک حصہ بظاہر نیک کام میں خرچ کرتے ہیں وہ نیکی نہیں ہے بلکہ الٹے گناہ کا ذریعہ ہے۔ اس بات کی بہترین مثال امام جعفر صادق علیہ السلام کا وہ واقعہ ہے کہ جس میں وہ ایسے شخص کی سرزنش کرتے ہیں جو نان بائی کے یہاں سے روٹی اور پھل والے کے یہاں سے انار چرا کر کچھ مستحقین میں تقسیم کرتا ہے اور یہ سمجھ رہا ہوتا ہے کہ وہ نیکی کر رہا ہے۔ امام علیہ السلام فرماتے ہیں کہ تو نے دوہری بدی کی۔ ایک تو بغیر اجازت کے دوسرے شخص کا مال حاصل کیا اور پھر بغیر اس کی اجازت کے تو نے اس کا مال تیسرے شخص کے حوالے کر دیا۔

۵۔ نہج البلاغہ کا خطبہ ۱۵ ملاحظہ فرمائیں کہ جب حضرت علی علیہ السّلام خلافت ظاہری پر متمکن ہوئے اور حضرت عثمان کی عطا کردہ جاگیریں جب مسلمانوں کو پلٹا دیں تو فرمایا:

”خدا کی قسم! اگر مجھے ایسا مال بھی نظر آتا جو عورتوں کے مہر اور کنیزوں کی خریداری پر صرف کیا جا چکا ہوتا تو اُسے بھی واپس پلٹا لیتا۔“

۶۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ سے منقول ہے، آپ نے فرمایا:

”جب قیامت برپا ہوگی تو منادی ندا کرے گا کہاں ہیں ظالم!

کہاں ہیں ظالموں کے مددگار؟

کہاں ہیں وہ لوگ جنھوں نے اپنے آپ کو ظالموں سے مشابہ بنایا تھا؟

حتیٰ کہ ان لوگوں کو بھی پکارا جائے گا جنھوں نے ان ظالموں کے لیے قلم تراشا یا ان کی دوات میں صوف ڈالا۔ ان سب کو لوہے کے ایک صندوق میں ڈال کر اکٹھا جہنم میں پھینک دیا جائے گا۔"

آج ضرورت اس بات کی ہے کہ علماء کرام اور ذاکرین سنجیدگی اختیار کریں اور اپنی ذمہ داریوں کو نباہیں۔ میں خاص طور پر تاج العلماء مولانا سید محمد ذکی صاحب اور مولانا مظاہر حسین صاحب امام جماعت، محمود آباد سے گذارش کروں گا کہ وہ فوری طور پر مدرسۃ الواعظین کی انتظامیہ کمیٹی کے رکن ہیں یہ لوگ خاموش تماشائی نہ بنے رہیں بلکہ یا تو اصلاح کریں ورنہ اظہارِ براءت کریں۔ اگر فوری توجہ نہیں دی گئی تو یہ قدیمی ادارہ ہاتھ سے نکل جائے گا۔

تحریکِ احترامِ منبر کی ضرورت

شہر لکھنؤ کو برِ صغیر ہندو پاک میں مرکزِ شیعیت کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔ یہاں سال بھر مجالس و محافل کا سلسلہ جاری رہتا ہے اور یہاں کے ذاکرین و شعرائے کرام ہندوستان و بیرونِ ہند بلائے جاتے ہیں۔ مگر دھیرے دھیرے اخلاقی پستی اور جہالت کے باعث معیار ذاکری اور معیار شاعری اتنا پست ہوگیا ہے کہ زیادہ تر ذاکرین کے بیانات اور شعراء کے کلام کا بیشتر حصہ ہجو مومنین اور نفرت پھیلانے کے لیے وقف ہوگیا ہے۔ ہماری یہ بات صحیح ہے یا غلط اس کا فیصلہ ہر وہ شخص کرسکتا ہے جس نے شہر لکھنؤ میں منعقد ہونے والی مجالس و محافل میں شرکت کی ہو یا یہ کہ یہاں کی محافل میں باہر سے آنے والے شعراء سے دریافت حال کیا جاسکتا ہے۔ بطور عبرت عرض کرنا ہے کہ ۲۵ مارچ ۱۹۹۰ء کو شیعہ کالج میں آل انڈیا شیعہ حسینی فنڈ کے زیر اہتمام "جشنِ زینب" کے عنوان سے ایک محفل کا انعقاد کیا گیا تھا۔ اس محفل میں شرکت کرنے والے ایک مردمومن نے مجھ سے بتایا کہ ½۱۲ بجے شب تک اس محفل میں شریک ہوئے تھے۔ لیکن جب ½۱۲ بجے شب تک ایک قطعہ بھی جناب زینب کی شان میں نہیں پڑھا گیا تو وہ اٹھ کر چلے آئے۔ اب وہاں پڑھا کیا گیا، تو آپ یہ سمجھیے کہ جو تقاریر ہوئیں اور جو

یہ مضمون پیام نو مورخہ ۳۰ مارچ ۱۹۹۰ء کی اشاعت میں شائع کیا جاچکا ہے

اشعار پڑھے گئے وہ مبنی بر گناہ تھے

صفِ عزا اور ذکرِ اہلِ بیت کے نام پر منعقد ہونے والی مجالس و محافل کی اس بے حرمتی کی جانب افرادِ ملّت کو متوجّہ کرنے کے لیے علی کانگریس کی جانب سے تحریک احترامِ منبر کا آغاز کیا گیا تھا۔ پہلے مقامی طور پر ہماری جانب سے یہ کوشش کی گئی کہ ذاکرین حضرات اپنے فرائض کو پہچانیں۔ مگر ان بدبختوں اور بے حیاؤں نے اور ڈھٹائی اختیار کر لی۔ بجائے اپنی اصلاح کرنے کے ان کمینوں نے صفِ عزا کا استعمال ہمارے خلاف رائے عامّہ کو بھڑکانے کے لیے وقف کر دیا۔ چنانچہ یہ جس بستی اور جس شہر بھی مجلس پڑھنے گئے انھوں نے ذکرِ حسینؑ کے نام پر نفرت کا بیوپار کیا۔ اگر بات صرف ہم پر لعنت بھیجنے یا ہماری کردار کشی تک محدود رہتی تو ہمیں کوئی پریشانی نہ ہوتی۔ مگر اس مذموم حرکت کے لیے صفِ عزا کا استعمال کسی طرح جائز نہیں ہے۔

دوسری طرف ان ذاکرین نے ایسے شاعروں کی سرپرستی فرمانا شروع کر دی جو ذاتیات اچھالنے اور بے ہودہ گوئی میں ان کا ساتھ دے سکیں۔ جس طرح بدمعاشو کے گروہ ہوتے ہیں اسی طرح ذاکرین اور شاعروں کے گروہ تیار ہو گئے ہیں۔ سوال اس بات کا ہے کہ لوگ یوں ہی ان کے ہاتھوں بے وقوف بنتے اور لٹتے رہیں یا یہ کہ اس لوٹ کے خلاف افرادِ ملّت کو بیدار کیا جائے۔

ہمارے نزدیک جو طرزِ ذاکری اور طرزِ شاعری اس وقت رائج ہو گئی ہے جس میں اتحاد و اخوت کے بجائے نفرت اور اختلاف کو بڑھاوا ملتا ہے وہ اجتماعی گناہ اور قومی خودکشی کے مترادف ہے اور مسلکِ اہلِ بیت کے لیے سمِّ قاتل کی

حیثیت رکھتا ہے اور اس غلط روش کو صحیح سمت عطا کرنا وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔

ہم کو یہ پیش نظر رکھنا ہوگا کہ امام حسین علیہ السلام نے اپنے اقدام کی مقصدیت کا اعلان ”امر بالمعروف، نہی عن المنکر اور سیرتِ رسولِ اکرمؐ و علی مرتضیٰؑ“ قرار دیا تھا۔ ظاہر سی بات ہے کہ جو مقصد حسینی ہے وہی یادِ حسین کا مقصد بھی ہونا چاہیے۔

اگر صفِ عزا یا محافل کو ذاتی اغراض کی تکمیل، قوم میں اختلافات کو ہوا دینے لوگوں کے جذبات کو مشتعل کرنے، دوسروں کے عقائد تولنے، آیات قرآنی کی من مانی تاویلیں کرنے کے لیے استعمال کیا جائے تو یہ حسینیت کی تبلیغ نہیں بلکہ یزیدیت کا پرچار ہوگا۔

لکھنؤ کے علماء و ذاکرین کی زیادہ تر تعداد یا تو اس غلط روش پر خود گامزن ہے، اور یا یہ کہ دوسروں کی اس غلط روش پر خاموش تماشائی بنی ہوئی ہے۔ آج تیرہ سال ہوگئے کہ لکھنؤ میں عزاداری کے جلوسوں پر پابندی عائد ہے۔ مگر ان کم بختوں کو عقل نہیں آئی۔ جس غلط روش پر چل کر جلوسہائے عزا پر پابندی عائد کروائی ہے اسی روش پر ابھی بھی اڑے ہوئے ہیں اور کوئی تعجب نہیں کہ مجلسیں بھی اسی طرح زد میں نہ آجائیں۔

ہم لکھنؤ کے باہر بسنے والے تمام شیعہ افراد سے دست بستہ گذارش کرتے ہیں کہ اگر وہ لکھنؤ کے ان بے لگام ذاکرین کا بائیکاٹ کریں گے تب ہی ان کو شاید سوچنے کا کوئی موقع ملے۔

آپ لوگ خود غور کریں کہ ہر عبادت کی بنیادی شرط ”اخلاص“ ہے۔

اُجمت پر مجلسیں پڑھنے والے کے پاس ”اخلاص“ کہاں؟ اگر دوسری بستیوں اور شہروں کے لوگ خود اپنے یہاں ذاکری فرمانے لگیں تو دھیرے دھیرے ہر بستی

میں خود ہی ذاکر تیار ہو جائیں گے اور دوسری طرف لکھنؤ کے ذاکرین کی سمجھ میں آجائے گا کہ اپنا وقت چرب زبانیوں کے بجائے "علم و معرفت" حاصل کرنے میں صرف کریں۔

ان ہی حالات کے پیش نظر یہ ضروری اور لازم ہے کہ احترام منبر کی طرف لوگوں کو متوجہ کرنے کے لیے تحریک چلائی جائے۔ اسی ضرورت کے پیش نظر لکھنؤ میں ۲۳ تا ۲۵ مارچ ۱۹۹۰ء "کل ہند احترام منبر سمینار" کا انعقاد کیا گیا۔ اللہ کا بے پایاں فضل واحسان ہے کہ اس نے ہم لوگوں کی نحیف آواز میں اتنا اثر عطا کیا کہ دور دور سے لبیک کی صدائیں آئیں۔ پوری سنجیدگی اور وقار کے ساتھ احترام منبر سمینار کا انعقاد ہوا۔ دوران سمینار ہی اس بات کا اعلان کیا گیا کہ بہت جلد دیگر مقامات پر بھی احترام منبر سمینار کا انعقاد کیا جائے گا۔

ہماری آپ سے گذارش ہے کہ آپ بھی اپنے حلقۂ اثر میں اس جانب لوگوں کو متوجہ کریں، ہم سے رابطہ رکھیں۔

لکھنؤ کی عزاداری

گذشتہ ۱۴ برسوں سے شہر لکھنؤ میں عزاداری کے جلوسوں پر پابندیاں عائد ہیں۔ حکومت اور انتظامیہ نے شیعوں کے مذہبی جلوسوں کو نقضِ امن کے اندیشے کے تحت بند کر رکھا ہے۔ شاید مستقبل میں جب کبھی تاریخ لکھی جائے تب کوئی غیر جانب دار مورخ انصاف سے لکھے گا کہ جلوس کے بند ہونے میں کس کا کتنا حصہ رہا ہے اور جلوسہائے عزا کی بحالی کی تحریکوں کو ناکام بنانے میں کس نے کیا کردار انجام دیا۔ مگر پھر بھی جو حضرات ملّت کا درد اپنے سینے میں رکھتے ہیں انھیں چاہیے کہ کبھی اس قومی المیہ پر بھی غور کریں، سوچیں کہ کیا کچھ قصور خود ہمارا اپنا بھی ہے یا نہیں؟ کہاں پر ہم نے غلطی کی۔ اگر اس کی تشخیص ہو جائے تو پھر اس انحراف کا علاج ممکن ہے ورنہ منزل سے بے خبری اس کارواں کو تباہی و ہلاکت کے سوا اور کچھ دینے والی نہیں۔

اس شہر میں مختلف مسلک اور مذاہب کے افراد رہتے ہیں۔ یہاں عزاداری کا رواج اور فروغ "مظلوم سے ہمدردی" کے عام انسانی اصول اور جذبے کی بنیاد پر ہوا۔ شاہان اودھ کے بعد جب اقتدار انگریزوں کے ہاتھ میں آیا تو انھوں نے "لڑاؤ اور حکومت کرو" کی پالیسی پر مختلف داخلی گروپ بندیوں

یہ مضمون پیام نو مورخہ ۶/ اپریل ۱۹۹۰ء کی اشاعت میں شائع کیا جا چکا ہے

کو بڑھاوا دیا۔ ایک طرف شیعہ سُنّی اختلاف کو ہوا دی تو دوسری طرف خود شیعوں اور سنیوں کے اندر مختلف گروپ بندیوں کو شہ دی۔ قوم خانوادوں میں بٹ گئی۔ عوام کی حمایت حاصل کرنے کے لیے سنجیدہ گفتگو کے بجائے جذبات سے کھیلنا زیادہ آسان اور جلد نفع دینے والا ہوتا ہے۔ چنانچہ اتحاد اسلامی کی باتیں کرنے کے مقابلے میں تبرّے بازی اور خود ساختہ مناظرے بازی نے رواج پایا۔ ایسی ذاکری رائج ہوئی کہ غیر شیعہ افراد کے لیے مجالس میں شرکت ممکن نہ رہی۔ بات یہیں تک رُک جاتی تو بھی خیر رہتی مگر اب مجالس میں ذکر حسینؑ کی آڑ میں شیعہ شیعہ منافرت کے بیج بوئے جانے لگے۔ شیعیت کی چودہ سو سالہ تاریخ میں جن باتوں کو کسی عالم دین نے "عقائد" میں شمار نہیں کیا، اُن غیر ضروری اور فالتو باتوں کو "عقیدہ" قرار دے کر اصولِ دین سے بھی بڑھا کر ذاکرین نے پیش کرنا اور ذہنوں میں زہر گھولنا شروع کر دیا۔ "یہ کیوں کہہ دیا"، "وہ کیوں لکھ دیا" کو لے کر حرامی، حلالی کے فتوے اور "کافر"، "وہابی ایجنٹ" اور "دشمنِ اہل بیت" قرار دیا جانے لگا۔ ہمارے علماء و ذاکرین یا تو براہ راست نفرت کے اس بیوپار میں شامل ہوئے اور یا خاموش تماشائی بنے رہے۔ ذہنوں میں نفرت پنپتی رہی۔ اختلاف اور افتراق کا پودا جڑ پکڑتا رہا۔ حسنِ ظن اور نیک گمان کے بجائے سوئے ظن اور بدگمانیوں کا دور دورہ ہوا۔ جلوسہائے عزا پر پابندی کے بعد بجائے اس کے کہ جلوسہائے عزا کی بحالی کی تحریکوں کا ساتھ دیا جاتا خود شیعوں ہی نے اس بات کی کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی کہ جلوسہائے عزا کی بحالی کی تحریکیں ناکام ہو جائیں۔ چند سال قبل جب علی کانگریس کی طرف سے ۲۱ر رمضان کو نجف کے

پاس احتجاجی گرفتاریاں دینے کا پروگرام تھا تو اُسی شب میں اس وقت کے ایک شیعہ لیڈر اور بڑے ذاکر صاحب نے مجھ سے فرمایا تھا کہ "آپ چاہتے ہیں کہ آپ کا گھوڑا آگے نکل جائے تو ہم آپ کا گھوڑا آگے نہیں نکلنے دیں گے"۔

آج علماء و ذاکرین قومی مسائل میں کتنا بے حس ہیں اور کسی بھی تعمیری پروگرام کی کس طرح مخالفت کرتے ہیں اس کا اندازہ ہر اُس شخص کو بخوبی ہو گیا ہوگا جس نے چند روز قبل منعقد ہونے والے "احترام منبر سمینار" میں شرکت کی ہو گی اور یا اس کی ویڈیو کیسٹ ملاحظہ کی ہو گی۔ ہم جانتے ہیں کہ موجودہ اختلاف وافتراق کو دور کر کے اتحاد قومی کو فروغ دینا اس وقت اتنا ہی ضروری ہے جتنا کسی دم توڑتے ہوئے مریض کو آکسیجن فراہم کی جائے۔ اسی لیے لکھنؤ کے علماء و ذاکرین کو فرداً فرداً دعوت نامے بھیجے۔ کتنوں سے ذاتی طور پر خود سمینار استقبالیہ کمیٹی کے کنوینر جناب منہاج رضا مرزا صاحب نے رابطہ قائم کیا۔ سمینار کی جگہ پر باقاعدہ لکھنؤ کے علماء کے چار مشہور خانوادوں کی علمی شخصیتوں کے نام سے گیٹ لگائے گئے۔ باب نجم الملت، باب ناصر الملت، باب باقر العلوم اور باب غفراں مآب۔ مگر ان خانوادوں سے وابستہ کتنے افراد اس سمینار میں آئے؟ تو کیا اس ذہنیت کے ساتھ عزاداری کے جلوسوں پہ سے پابندی ہٹ سکتی ہے؟

ہم لوگوں نے قوم کے حالات کو بہت قریب سے دیکھنے کے بعد یہ محسوس کیا کہ عزاداری بغیر دین فہمی کے کوئی معنی نہیں رکھتی۔ جب تک افرادِ ملت میں دین کا فہم اور حق و باطل میں تمیز کا شعور نہیں بیدار ہوتا قوم یوں ہی بے عمل علماء اور مفسد ذاکرین کے ہاتھ کا کھلونا بنتی اور لٹتی رہے گی۔ یہ لوگ قوم کا

نمائندہ بن کر حکومت سے قربت حاصل کریں گے۔ قوم بھٹکتی رہے گی اور یہ اپنے ذاتی مقاصد قومی مسائل کی آڑ میں حاصل کرتے رہیں گے۔

اگر اصلاح قوم کی کوئی سنجیدہ کوشش کی جائے تو اس کی شروعات اختلاف کے بجائے اتحاد پر رکھنی ہوگی۔ جن لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ صف عزا کا دین سے کوئی تعلق نہیں ہے ان کو اپنی روش کو درست کرنا ہوگا۔ صف عزا کو فالتو بحثوں اور ذاتیات کے جھگڑوں سے پاک وصاف رکھنا ہوگا اور اپنی نیک نیتی ثابت کرنی ہوگی۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک شخص ایک طرف عزاداری کے جلوسوں کی بحالی کی بات بھی کرے اور دوسری طرف اوقاف کے لٹیروں اور دلالوں کے ساتھ بھی رہے، واجبات الٰہی کا مضحکہ اڑائے اور نفاق بین المومنین کو بڑھاوا دینے والی تقریریں بھی کرتا رہے یا اشاعت علم اور تبلیغ دین کی مخالفت کرے۔

توہینِ اہلبیتؑ کا مرتکب کون؟

ہم ائمۂ طاہرینؑ علیہم السّلام کو انسان کامل اور معصوم عن الخطا مانتے ہیں اور ہر ایسی روایت یا طرز ذاکری کو اُن کی شان کے خلاف مانتے ہیں جس میں ان پاکیزہ ہستیوں سے ایسی باتیں منسوب کی جائیں جو حکم الٰہی کے خلاف ہوں۔ چنانچہ اسی سلسلے سے "گھوڑا چھاپ تلاوت" والی روایت کے خلاف "پیام نو" میں لکھا گیا۔ وہ ذاکرین جو اس طرح کی جھوٹی باتیں پڑھنے کے عادی ہو گئے ہیں انھوں نے اس اصلاحی اقدام کی مخالفت کی۔ مگر وقت خود فیصلہ کرتا چلا جاتا ہے کہ حق کیا ہے اور باطل کیا ہے۔

اسی طرح کی ایک اور بات کہ جس سے بڑھ کر حضرت علیؑ کی توہین ممکن نہیں ہے وہ فضائل کے نام پر ذاکرین پڑھتے ہیں اور مومنین کرام بغیر سمجھے بوجھے واہ واہ کر کے گناہگار ہوتے ہیں۔

آپ نے بہت سے ذاکرین اور شعرا سے سُنا ہوگا کہ وہ حضرت علیؑ کو نُصیریوں کا خدا کہتے ہیں۔ اگر واقعی ایسا کوئی فرقہ موجود ہے جو حضرت علیؑ کو خدا مانتا ہے تو اس بات پر شیعانِ علیؑ کو خوش ہونا چاہیے یا افسوس کرنا چاہیے؟ اور یہ بات حضرت علی کی فضیلت قرار پائے گی یا ان کی توہین کرنا ہے؟

یہ مضمون پیام نو مورخہ ۱۳ر اپریل ۱۹۹۰ء کی اشاعت میں شائع کیا جا چکا ہے

آئیے ذرا ان سوالات پر غور کریں۔

جن کو لوگ اللہ کا ہمسر بنا کر خدائی کا درجہ دیتے ہیں ان کے لیے روز قیامت سخت منزل ہوگی۔ غیر اللہ کو خدائی کا درجہ دینے والے خود تو کافر ہیں ہی، جن کو وہ خدا مانتے ہیں اُن کو بھی جہنم میں ڈالنے یا ان کا مواخذہ کرنے کی بات قرآن کریم میں کہی گئی ہے۔

سورہ صافات کی ۲۲ ویں و ۲۳ ویں آیات میں ارشاد ہوا:

اُحْشُرُوا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَ اَزْوَاجَهُمْ وَمَا كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ ۙ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَاهْدُوْهُمْ اِلٰى صِرَاطِ الْجَحِيْمِ ۝

"(اور فرشتوں کو حکم ہوگا کہ) جو لوگ سرکشی کرتے تھے ان کو، اُن کے ساتھیوں کو اور بجائے اللہ کے جن کی یہ لوگ عبادت کیا کرتے تھے اُن (سب کو) اکٹھا کرو اور پھر انھیں جہنم کی راہ دکھاؤ۔"

سورۂ انبیاء کی ۶۷ ویں آیت میں کافروں کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے:

اُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ

"تف ہے تم پر اور اُس چیز پر جسے تم اللہ کے سوا پوجتے ہو۔"

سورۂ انبیاء ہی کی ۹۸ ویں آیت میں ارشاد ہوا:

اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ ط

"(کافروں سے کہا جائے گا) تم اور تم جس کی تم اللہ کے سوا پرستش کرتے تھے یقیناً جہنم کا ایندھن ہوگے۔"

سورۂ فرقان کی ۱۷ ویں آیت میں ارشاد ہوا:

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ وَمَا يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَقُوْلُ ءَاَنْتُمْ اَضْلَلْتُمْ عِبَادِيْ هٰٓؤُلَآءِ اَمْ هُمْ ضَلُّوا السَّبِيْلَ ۝

"اور جس دن اللہ ان لوگوں کو اور جس کی یہ لوگ اللہ کو چھوڑ کر پرستش کیا کرتے ہیں، ان سب کو جمع کرے گا اور (ان کے ان معبودوں سے) پوچھے گا کیا تم ہی نے ہمارے ان بندوں کو گمراہ کر دیا یا یہ کہ یہ لوگ راہِ راست سے بھٹک گئے تھے؟"

آپ جانتے ہیں کہ جناب عیسیٰؑ کو خدا ماننے والے لوگ ہیں۔ اس سلسلے میں قرآن کریم نے متعدد آیات میں روشنی ڈالی ہے۔ سورہ مائدہ کی ۱۷ ویں آیت اور ۷۲ ویں آیت میں ارشاد ہوا:

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ؕ

"یقیناً وہ لوگ کافر ہیں جو کہتے ہیں کہ اللہ تو عیسیٰ ابن مریم ہیں"۔

اسی آیت کے اصول پر اگر کوئی فرقہ حضرت علیؑ کو خدا مانتا ہے تو وہ کافر قرار پائے گا اور کافروں کے کفر پر شیعانِ علیؑ کا واہ واہ کرنا اور اظہارِ مسرت کرنا یقیناً ایک مذموم فعل ہے۔

جن لوگوں نے حضرت عیسیٰؑ کو خدا کہا تو اُن کے اس عمل کا تعلق اُن ہی کی ذات تک محدود نہیں ہے۔ بلکہ جناب عیسیٰؑ سے بھی اس سلسلے میں روزِ قیامت مواخذہ ہوگا۔ اللہ اکبر۔

سورۂ مائدہ کی ۱۱۶ ویں آیت میں ارشاد ہوا:

وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ

لِلنَّاسِ اتَّخِذُونِي وَاُمِّيَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قَالَ سُبْحٰنَكَ مَايَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اَقُوْلَ مَالَيْسَ لِيْ ق بِحَقٍّ ؕ اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ ؕ

"اور جب (قیامت میں عیسیٰؑ سے) اللہ فرمائے گا کہ "(کیوں) اے مریم کے بیٹے عیسیٰ! کیا تم نے لوگوں سے یہ کہہ دیا تھا کہ اللہ کو چھوڑ کر مجھ کو اور میری ماں کو خدا بنا لو؟" عیسیٰ جواب دیں گے "تو پاک و پاکیزہ ہے میری یہ مجال نہ تھی کہ میں ایسی بات منھ سے نکالوں جس کا مجھے حق نہ ہو اگر میں نے ایسا کہا ہوتا تو یقیناً تیرے علم میں ہوتا"

اسی طرح اگر واقعی کوئی فرقہ نصیری ہے تو وہ مسلمانوں کا فرقہ نہیں ہو سکتا بلکہ کافروں کی جماعت ہوگی جس کا تذکرہ اس انداز سے منبروں سے کرنا کہ لوگ واہ واہ کریں قطعی نامناسب ہے۔ جو ذاکرین اس قسم کی باتیں منبروں سے پڑھتے ہیں ان سے ہماری گذارش ہے کہ وہ خود تاریخ کا مطالعہ کر کے مندرجہ ذیل سوالات پر غور کریں۔

۱۔ دورِ رسالت مآب میں کتنے نصیری تھے اور انھوں نے کس کس جنگ میں حضرت علیؑ کی نصرت کی اور ان کے ہم رکاب ہو کر جہاد میں حصہ لیا۔

۲۔ جنگِ جمل، جنگ صفین اور جنگ نہروان میں کتنے نصیریوں نے حضرت علی علیہ السّلام کی نصرت کی؟

۳۔ حضرت علیؑ کی شہادت کے بعد امام حسنؑ کی نصرت کتنے نصیریوں نے کی؟

۴۔ کربلا کے میدان میں امام حسین علیہ السّلام کا ساتھ کتنے نصیریوں نے دیا؟

۵۔ کیا نصیریوں کا حضرت علیؑ کو خدا کہنا خود حضرت علیؑ کی تکذیب کرنا نہیں ہے کہ پھر آخر حضرت علیؑ نے کس کو سجدے کیے؟ کیا رسول اکرمؐ کی تکذیب کرنا اور قرآن کی تکذیب کرنا نہیں قرار پائے گا بلکہ تمام معصومین کی تکذیب کرنا نہیں ہوگا کہ کسی نے سچ بات کیوں نہیں بتائی؟

۶۔ اگر واقعی ایسا کوئی فرقہ موجود ہے تو پھر ان ذاکرین کو چاہیے کہ وہ نصیریوں سے رابطہ قائم کر کے کلام امیر المومنین حاصل کریں جو ان کے یہاں قرآن کی جگہ پر پڑھا جاتا ہو۔ ظاہر سی بات ہے کہ اُن کے پاس جو کلام محفوظ ہوگا وہ نہج البلاغہ سے کئی گنا زیادہ ہونا چاہیے۔

کسی چیز یا شخص کا بعض لوگوں کے ذریعے خدا مان لیا جانا اس کی فضیلت نہیں ہوتی۔ فرعون یا نمرود کو کوئی صاحبِ فضیلت نہیں کہے گا۔ پھر ہمارے ملک میں تو انسانوں کے علاوہ پتھروں، چوہے، بندر تک کو خدا ماننے والے موجود ہیں آپ زیادہ دور نہ جائیں بلکہ چوک کوتوالی سے ملحق مندر میں آپ کو زنجیر سے بندھا ہوا ایک بندر ملے گا۔ بہت سے لوگ اس بندر کا پیر اپنے سر پر رکھوا کر آشیرباد لیتے ہیں تو کیا اس سے وہ بندر صاحبِ فضیلت قرار پائے گا؟

حضرت علی علیہ السلام کی فضیلت اللہ تبارک وتعالیٰ کا نیک، مخلص اور انتہائی فرماں بردار بندہ ہونے میں ہے ایسا بندہ جو اللہ کی نافرمانی کرنا تو کیسا نافرمانی کا تصور بھی نہ کر سکے۔ ان کو خدا کہنے والے یا ان کو خدا کہنے والوں کی مدح وثنا کرنے والے یقیناً حضرت علی علیہ السّلام کے سب سے بڑے دشمن اور ان کی توہین کے مرتکب ہیں۔

خطرے کی جڑ

اصلاح قوم کا کیا طریقہ ہونا چاہیے اس سے پہلے یہ سوال اٹھتا ہے کہ اصلاح کی ضرورت ہے یا نہیں؟ اگر کوئی شخص اپنے کو شیعہ کہتا ہے تو وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ اصلاح کی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ وہ عقیدۂ ظہورِ مہدیؑ رکھتا ہے۔ اگر اس کے نزدیک اصلاح کی ضرورت نہیں ہے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ موجودہ حالات سے پوری طرح مطمئن ہے۔ ایسی صورت میں پھر وہ کس بات کا انتظار کر رہا ہوگا؟ لہٰذا ہر وہ شخص جو امام زمانہ کا منتظر ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ موجودہ حالات کو اطمینان بخش نہ سمجھے بلکہ اسے ظلم کے خلاف جنگ کرنے اور عدل کو قائم کرنے کے لیے اپنی زندگی کو وقف کر دینا چاہیے کیونکہ یہی امام زمانہ کے ظہور کا مقصد بھی ہوگا۔

ہمارے نزدیک اس وقت لکھنؤ میں شیعیت بہت بڑے خطرے سے دوچار ہے۔ یہ خطرہ نہ ہندوؤں سے ہے اور نہ مسلمانوں کے دیگر فرقوں سے ہے۔ بلکہ یہ خطرہ خود اپنوں ہی سے ہے اور اس کے لیے ہماری قوم کے چار طرح کے افراد ذمہ دار ہیں۔ بے عمل علماء، مفسد ذاکرین، اوقاف

یہ مضمون پیام نو مورخہ ۲۷ مارچ ۱۹۹۰ء کی اشاعت میں شائع کیا جا چکا ہے۔

کے لٹیرے اور یزیدی ذہنیت کے حامل افراد۔

۱۔ بے عمل عُلماء

عُلماء کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے علم کی بنیاد پر اصلاح معاشرہ کی کوششوں میں سب سے آگے رہیں۔ جہالت کے خلاف علم جہاد بلند کریں اور جہالت کی تاریکیوں کو علم کی شمع روشن کر کے دور کریں۔ لوگوں کو اللہ کے غضب سے ڈرائیں، خوف آخرت دلائیں۔ اپنی شخصیت کو بچانے کے بجائے دین کی محافظت کو اوّلیت دیں۔ اب جو عالم دین اپنی شخصیت کے جال سے آزاد ہو کر اپنی زندگی کو دین کی خدمت کے لیے وقف کر دے گا تو وہی عالم باعمل ہو گا جو صحیح معنی میں "نائب امام" کہے جانے کا مستحق ہو گا۔ اس کا وجود سماج کے لیے بابرکت قرار پائے گا۔ اس کی ذات ایک پُل کی طرح افرادِ ملّت کو رضائے الٰہی سے وابستہ کرنے کا ذریعہ بنے گی۔

اب آپ ذرا اپنے چاروں طرف نگاہیں دوڑا کر دیکھیے کہ لکھنؤ کے کتنے علماء اس معیار پر پورے اترتے ہیں؟ کچھ ایسے ہیں جو علم ہی نہیں رکھتے ہیں مگر علماء کا لباس زیب تن کیے عالم بنے ہوئے ہیں۔ ان کا جہل ان کو اس بات سے روکتا ہے کہ وہ حصول علم کے لیے آگے بڑھیں۔ ان کی حیثیت "منافق" کی طرح ہے جو مسلمان نہیں ہوتا ہے مگر اپنے کو مسلمان ظاہر کرتا ہے۔

کچھ ایسے ہیں کہ جنھوں نے دین کو محض پیشہ کی حیثیت سے اختیار کیا ہے یعنی ان کا علم محض اپنے پیٹ کی آگ بجھانے کا ایک ذریعہ ہے۔ کسی مدرسہ میں

نوکری کرلی۔ نکاح یا طلاق پڑھ دیا یا کہیں سے خمس و زکوٰۃ حاصل کرلیا۔ ان کا مقصد اپنی شخصیت کو مقدم قرار دیتے ہوئے ہر طرح کی مخالفت سے بچتے ہوئے ایک پرسکون زندگی گذارنا ہے۔ یہ اصلاح معاشرہ کے لیے کسی بھی عملی قدم سے بچتے ہیں۔ کیونکہ جب بھی اصلاح کی بات آئے گی تو کچھ نہ کچھ لوگوں کو اذیت پہنچے گی جس کے نتیجہ میں مخالفت ہوگی اور یہ مخالفت کا خطرہ مول نہیں لے سکتے۔

ان کے علاوہ کچھ ایسے ہیں کہ جنھوں نے اصلاحِ معاشرہ کے نام پر اپنے کو پیسہ سے متعلق کرلیا ہے۔ بجائے اس کے قرآن کریم اور سنّت نبویہ کی روشنی میں طریقۂ کار کا تعین کرتے، معاشرے کی دُکھتی ہوئی رگ پر ہاتھ رکھتے، جہالت کا مقابلہ کرتے، انھوں نے اس مشہور محاورے "سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے" کے مصداق اصلاح معاشرہ کا وہ طریقہ اختیار کرلیا ہے کہ کہنے کو کام بھی ہو رہا ہے، واہ واہی بھی مل رہی ہے۔ لیکن اگر کوئی صاحب انصاف سے تجزیہ کریں تو معلوم ہوگا کہ بہت خوب صورتی کے ساتھ اپنی ذمہ داریوں سے بچا جارہا ہے۔ اپنے کو پیسے سے متعلق کرنے والے علماء دین ایک ایسی "خودکشی" کے مرتکب ہیں جو اجتماعی قتل کے مترادف ہے۔

جو دل چسپ بات ہے وہ یہ کہ بے عمل علماء اگر محض بے عمل ہی رہ جاتے تب بھی شاید اتنی خرابی نہ آتی۔ مگر یہ لوگ ساتھ میں بدعمل بھی ہیں۔ خود تو اشاعت علم سے کوسوں دور ہیں اشاعت علم کی مخالفت بھی کرتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کے چاروں طرف خوشامدی اور متعصب افراد کی ایک

ٹولی موجود ہے جو اپنے آقاؤں کے اشارے پر بہت خاموشی کے ساتھ معاشرے میں زہر گھولنے اور افرادِ ملّت کو مخلص قومی خدمت کرنے والوں سے بدظن کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ پھر زیادہ دولت کے ساتھ جو خرابیاں وابستہ ہیں وہ ایسے علماء کے یہاں آپ کو آسانی سے نظر آجائیں گی۔

۲۔ مفسد ذاکرین

علماء کی بے عملی کی وجہ سے جو نقصانات قوم کو پہنچے ہیں ان میں سرفہرست ایسے افراد کا منبر پر آجانا ہے کہ جنھوں نے نفاق پھیلانا اپنا نصب العین بنا لیا ہے۔ مختلف غیر اہم اور غیر متعلق باتوں کو موضوع گفتگو بنا کر ان لوگوں نے قوم میں اتنی نفرت پھیلائی ہے کہ ایک دوسرے پر سے لوگوں کا اعتماد اُٹھ گیا ہے۔ حسد و کینہ، بدی و غیبت، تہمت و بہتان تراشی اب ہمارے لیے کوئی غیر معمولی بات نہیں رہ گئے ہیں۔ لوگ ان ذاکرین کی مبنی بر گناہ تقاریر کو عبادت سمجھ کر سنتے ہیں۔ بہرحال جو حالات کا رُخ ہے وہ بتا رہا ہے کہ اب شہر لکھنؤ میں جلوسہائے عزا کے بعد مجالس کے بند ہونے کی باری آگئی ہے۔

۳۔ اوقاف کے لٹیرے

حالیہ چند برسوں میں زمینوں کے دام بہت تیزی کے ساتھ بڑھے ہیں۔ لہٰذا اسی رفتار سے زمینوں کی لوٹ مار بھی بڑھ گئی ہے۔ امام حسین علیہ السلام کل بھی مظلوم تھے اور آج بھی مظلوم ہیں۔ افسوسناک بات یہ ہے کہ اوقاف

کے ان لٹیروں کو سماج میں وقار حاصل ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ جو نفرت ہم کو خیام حسینی کے لوٹنے والوں سے ہے اُس سے زیادہ نفرت اوقاف کے ان لٹیروں سے ہوتی۔ کیونکہ یہ اوقاف کے لٹیرے دوست اور محافظ بن کر لوٹنے میں لگے ہوئے ہیں

۴۔ یزیدی ذہنیت

علماء کی بے عملی اور مفسد ذاکرین کی نفاق میں ڈوبی ہوئی تقاریر کے نتیجے میں آج ہمارے معاشرے میں "جدید یزیدیت" ابھر کر سامنے آگئی ہے۔ جس طرح کربلا کا واقعہ رونما ہوا کہ امام حسینؑ پوچھتے رہے کہ بتاؤ میرا قصور کیا ہے؟ کیا میں نے حرام محمدی کو حلال کر دیا ہے؟ کیا میں نے حلال محمدی کو حرام کر دیا ہے؟ کیا میں نے آئین شریعت میں تبدیلی کر دی ہے؟ مگر بے جرم وخطا ان کا خون بہا دیا گیا۔ اسی طرح آج ہمارے سماج میں بھی دوسرے کی جان ومال وآبرو پر بغیر کسی شرعی جواز کے حملہ کرنے میں کسی کو کوئی عار نہیں۔ افرادِ ملت "تولاّ" کے مفہوم سے یکسر نا آشنا ہیں۔ اس جدید یزیدیت کے نتیجہ میں قوم کا شیرازہ منتشر ہو رہا ہے۔ جہاں نفرت عام ہو جائے وہاں پھر اجتماعی اصلاح کا تصور بھی گناہ کے مترادف ہوتا ہے۔ عوام اپنی جہالت پہ مطمئن اور خواص اپنی "حکمت عملی" پر مسرور رہتے ہیں مگر یہ بھول جاتے ہیں کہ وقت خود فیصلہ کرتا ہوا آگے بڑھ جاتا ہے۔ تاریخ خود بے عمل افراد کو ٹھوکر مارتی ہوئی آگے بڑھ جاتی ہے۔ موقع پہ زک دینے والے کو انجام کی خبر نہیں ہوتی کہ یہ نشتر اُس نے خود اپنے ہی دل میں چبھوئے ہیں۔

قوم ٹوٹ رہی ہے، تباہ ہو رہی ہے۔ ایسے عالم میں ضرورت اس بات کی ہے کہ مخلص افراد کی ایک جماعت اُٹھ کھڑی ہو جو مخالفتوں کے طوفان کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو جو ملامت کرنے والوں کی ملامت سے بے پرواہ ہو کر شیعیت کی سربلندی کے لیے میدان عمل میں ڈٹ جائیں۔ ورنہ یہ جدید یزیدیت بے عمل علماء اور مفسد ذاکرین کی بیساکھی کے سہارے پوری قوم کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی۔

طریقۂ کار

گذشتہ مضمون میں ہم نے عرض کیا کہ ہماری قوم کو اس وقت سب سے زیادہ خطرہ خود اپنی ہی قوم کے چار طرح کے افراد سے ہے:

۱۔ بے عمل علماء ۲۔ مفسد ذاکرین ۳۔ اوقاف کے لیڈرے اور ۴۔ یزیدی ذہنیت کے حامل افراد۔

ان افراد سے پیدا ہونے والے خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ افرادِ ملّت تک دین کے پیغام کو پہنچایا جائے۔ ان کو حقیقی علماء کی تحریروں سے آگاہ کیا جائے تاکہ لوگوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ ایک دین تو وہ ہے جو حضرت علی علیہ السّلام کا دین تھا جس پر ہمارے دیگر ائمہ عمل پیرا رہے۔ اس دین پر عمل کرنے کے لیے علم کی ضرورت ہوتی ہے۔ حالات کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے، قربانی دینی پڑتی ہے۔ اللہ کی معرفت اور رسول اکرمؐ اور آلِ رسولؐ کی سیرت سے واقفیت حاصل کرنی ہوتی ہے، واجبات کو ادا کرنا پڑتا ہے۔ یہ وہ دین ہے جس کی جھلکیاں ہم کو اپنے علماء حق کی تحریروں میں ملتی ہیں۔ اس دین حق کے مقابلہ میں ایک "باطل دین" گڑھ لیا گیا ہے۔ اس باطل دین کو علم و معرفت کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ نہ ہی کسی قسم کے آداب و اخلاق سے کوئی واسطہ ہوتا ہے۔ آدمی

یہ مضمون پیام نو مورخہ ۴ رمئی ۱۹۹۰ء کی اشاعت میں شائع ہو چکا ہے

چاہے واجبات کا مضحکہ اڑائے، شراب نوشی کرے، جوا کھیلے، لڑکیوں کی دلالی کرے، اوقاف کو لوٹ کھائے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بس بغیر سمجھے بوجھے گالیاں بکنا جانتا ہو۔ آخرت کے لیے اپنی فکر کرنے کے بجائے دوسرے کو جہنمی کہتا رہے جھوٹ بولنے اور بدی غیبت کرنے میں اسے کوئی تکلیف نہ ہو، قرآن کو بے کار سمجھتا رہے، ائمہؑ طاہرین کی سیرت کا مطالعہ کرنا کیسا ان کے نام بھی نہ جانتا ہو، مگر اپنے کو محب اہل بیت اور دوسرے کو دشمن اہل بیت کہتا رہے اس کے لیے کافی ہے۔ دین حق کے "اصول دین" اور ہیں اور باطل دین کے "اصول دین" اور ہیں۔

بحمد اللہ پیام نو کے ذریعہ دین حق کو پہنچوانے کا کام شروع کیا گیا اور اس کے خاطر خواہ نتائج سامنے آنے لگے۔ ہم کو پتہ ہے کہ جس کام کا ہم لوگوں نے بیڑا اٹھایا ہے وہ بہت بڑا کام ہے۔ جس شہر میں علماء کا کام محض چند رسومات کی ادائیگی یا رمضان اور عید کے چاند کے اعلان تک محدود ہو وہاں "دین فہمی" کی تحریک چلانا آسان کام نہیں ہے۔ پھر جہاں پچھلے پچاس برس سے "کتاب شہید انسانیت" یا "عروسی قاسم" یا دیگر غیر ضروری باتوں کو بنیاد بنا کر مسلسل زہر گھولا جا چکا ہے۔

جہاں نظریاتی اختلاف کی بنیاد پر مجلسوں میں اینٹیں پھینکنا، گالم گلوج کرنا یا فوجداری کر لینا کارِ خیر سمجھا جانے لگا ہو، جہاں حق و باطل کا فیصلہ شخصیت پرستی یا خاندان پرستی کی بنیاد پر کیا جاتا ہو وہاں اصولوں کی بات کرنا، قرآن و حدیث کی طرف لوگوں کو متوجہ کرانا، اولین دور کے علماء کی تحریروں کا حوالہ دینا یقیناً عجیب بات تھی۔

مگر ہم اللہ تعالیٰ کے شکر گزار ہیں کہ اس نے ہم لوگوں کی توفیقات میں اضافہ اور اپنے دین کی خدمت کرنے کا جذبہ عطا فرمایا۔

ایک مختصر سی مدت میں ہی "دین فہمی" کے اثرات ظاہر ہونے لگے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض حلقوں میں دین فہمی کی مخالفت بھی ہے۔ مگر ہم جانتے ہیں کہ یہ مخالفت کرنے والے وہ لوگ ہیں جنھوں نے ہماری تحریروں کو پڑھا ہی نہیں ہے۔ ان لوگوں نے پڑھا ہوتا تو بجائے گالم گلوج کرنے یا بدی غیبت کہنے کے ہم سے سوالات کرتے، ہم سے پوچھتے کہ آپ نے یہ بات کہاں سے لکھی؟ ظاہر سی بات ہے کہ اگر ایک شخص نے بچپن سے سُنی سُنائی باتوں پر اپنے دین کی عمارت تعمیر کر رکھی ہے اور ایک دم سے کوئی ایسی بات اس کے سامنے آجائے جس سے وہ پوری عمارت ہل کر رہ جائے تو اُسے ایک جھٹکا تو محسوس ہوگا ہی۔ اب یہ اس کے اوپر ہے کہ وہ باطل ہی پر اکتفا کیے رہنا چاہتا ہے یا حق کا متلاشی ہے۔

جہاں تک ہمارا سوال ہے نہ ہمیں موافقت کی طلب ہے اور نہ ہی مخالفت کا خوف۔ ہماری ذمہ داری بس پیغام پہنچانا ہے۔ اگر کوئی حق کو قبول کرے گا تو اُس کا کوئی احسان ہم لوگوں پر نہیں ہوگا اور اگر کوئی شخص حق کو ٹھکراتا ہے اور باطل پر ہی اَڑا رہنا چاہتا ہے تو اس کا کوئی گناہ ہمارے اوپر نہیں ہوگا۔ ہمیں اپنے مقصد کی حقانیت اور طریقۂ کار کی درستگی پر پورا یقین ہے۔ ہم اللہ ہی پر بھروسہ کرتے ہیں جس کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور ہمیں اس کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

قوت فیصلہ

قومی حالات کی بہتری کے لیے پہلی شرط افرادِ ملّت کو دینی و قومی معاملات میں "عقل" کو استعمال کرنے کی دعوت دینا ہے تاکہ لوگ درپیش مسائل میں صحیح فیصلہ کر سکیں۔ علم و عقل کی بنیاد پر صحیح روش اختیار کرنا ہی حکمت کہلاتا ہے جو اپنی خواہشات کی پیروی یا اندھی تقلید کی ضد ہے۔ حضرت علی علیہ السّلام کی جو روش اس سلسلہ میں رہی ہے اس کے لیے قارئین کرام کی خدمت میں جناب سید محمد تقی صدر، عالمی فلسفہ کانگریس، کے مضمون کی چند سطریں پیش کر رہا ہوں

"یہ بات ریکارڈ پر آنے کی ہے کہ علیؑ تاریخ کی وہ واحد شخصیت ہیں جنھوں نے عقل کو تہذیب کی سب سے بڑی قدر کے طور پر منوایا ہے۔

عقل و علم لازم و ملزوم ہیں۔ اس لیے عقل کے ساتھ ساتھ علم پر بھی پوری تاکید کلام علیؑ میں ملتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ علم پر اصرار بعض دوسرے مذہبی ادب میں بھی ملتا ہے مگر عقل کی مرکزیت پر اصرار صرف حضرت علیؑ ہی کے یہاں موجود ہے۔ جبکہ عام مذہبی ادب میں یا تو عقل کا ذکر ہی نہیں ہے یا ہے تو سرسری۔

یوں تاریخ تہذیب کی — علیؑ — ہی وہ واحد مذہبی شخصیت

یہ مضمون پیام نو مورخہ ۲۵ رمئی ۱۹۹۰ء کی اشاعت میں شائع ہو چکا ہے

ہیں جو سارے عقائد کو عقل کی کسوٹی پر پرکھنے کا بار بار مشورہ دیتے ہیں اس پہلو پر بار بار اصرار کرتے ہیں۔ اس لیے بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام دانشوروں کے قبیلے کے ہیرو کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ایک بات کی وضاحت (اور) ضروری ہے کہ ــــ عقل پر اصرار اور عقل کو ہر معاملے میں حکم قرار دینے کے معاملے میں عقل سے مراد، فرد کی اپنی عقل ہے۔ یعنی مدعا یہ ہے کہ جو فیصلہ بھی ہو عقل سے ہو، جذبات اور خواہشوں کے تحت نہیں ــــ افلاطون نے کہا تھا:

"جدھر بھی دلیل مجھے لے جائے گی میں اسی طرف چلا جاؤں گا۔"

افلاطون کی یہ نصیحت فلسفیوں کے حلقے تک محدود ہو کر رہ گئی۔ مذاہبِ عالم کی پوری تاریخ میں علی وہ واحد مذہبی قائد ہیں جنھوں نے نسلِ انسانی کے ہر فرد کو یہ مشورہ دیا کہ وہ جو فیصلہ بھی مسائلِ حیات و کائنات کے بارے میں کرے اس کے لیے آخری حکم اپنی عقل کو قرار دے، خواہشوں، اُمنگوں یا نفرتوں کو نہیں۔"

(حوالہ "حکمت بوتراب" مطبوعہ کراچی صفحہ 'ک'، 'ل')

آج قومی انتشار کا بنیادی سبب عقل کو بالائے طاق رکھ کر محض جذبات اور نفرت کو بالاتری حاصل ہو جانا ہے۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ ہم کسی بھی مسئلہ میں فیصلہ کرنے سے قاصر ہو گئے ہیں۔ ذاتی اغراض کی خاطر تہمت لگانے اور بہتان تراشی کرنے والوں اور بدگمانی پھیلانے والوں کو کھل کھیلنے کا موقع ہاتھ آگیا ہے۔

میدان صاف ہے۔ جانتے ہیں کہ ہم جو چاہے جھوٹ بول دیں، عوام میں اتنا شعور نہیں ہے کہ وہ یہ فیصلہ کر سکیں کہ جھوٹ کیا ہے اور سچ کیا ہے؟

ہو سکتا ہے کسی کو جھوٹ بول کر یا قومی زندگی میں نفرت کا زہر گھول کر وقتی فائدہ حاصل ہو جائے مگر یہ روش دھیرے دھیرے ہمارے معاشرہ کو گھن کی طرح کھائے جا رہی ہے۔ اس صورت حال کے علاج کے لیے ضروری ہے کہ جب اس طرح کی کوئی بات کسی کے کانوں تک پہنچے تو وہ اس بات کو کسی اور سے بیان کرنے سے پہلے خود تحقیق کر لے۔ اس سلسلہ میں بطور مثال ایک تازہ بات پیش ہے۔

حدیث کساء کو لے کر آج کل کچھ اس انداز سے گفتگو ہو رہی ہے کہ گویا ہم لوگوں نے حدیث کساء کا انکار کیا ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ہماری طرف سے اس سلسلہ میں کوئی گفتگو ہی نہیں کی گئی۔ جہاں تک ہمارے علم میں ہے اس طرح کی کوئی بات پورے ہندوستان میں کسی نے نہیں کہی۔ ایک عالم دین نے مجھ سے یہ بتایا ہے کہ آقائی ابوالقاسم الخوئی کے ایک قریبی شاگرد اور عالم شیخ مرتضیٰ العسکری نے حدیث کساء کی سند کو ضعیف قرار دیا ہے۔ شیخ مرتضیٰ العسکری نے اس سلسلے میں ایک کتابچہ تحریر فرمایا ہے جو اردو، انگریزی، عربی اور فارسی میں شائع ہو چکا ہے۔ انھیں عالم دین نے یہ بھی بتایا کہ مولانا ذیشان ہدایتی صاحب نے شیخ مرتضیٰ العسکری کی کتاب کی رد میں ڈھائی سو صفحات پر مشتمل مضمون لکھ کر شیخ مرتضیٰ العسکری کو بھیج دیا ہے۔ مولانا ذیشان ہدایتی صاحب قبلہ لائق مبارکباد ہیں کہ انھوں نے صحیح علمی طریقہ اختیار کیا کہ تحریر کے جواب

میں تحریر لکھی۔ اب یہ شیخ مرتضیٰ العسکری صاحب پر ہے کہ وہ مولانا ذیشان ہدایتی صاحب کے نکات کی روشنی میں اپنے موقف پر نظر ثانی کریں یا اپنے نظریے کی مزید وضاحت کریں۔ ہم علماء و ذاکرین کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ بھی مولانا ذیشان ہدایتی صاحب کے طرزِ عمل سے سبق حاصل کریں اور تحریروں کا جواب تحریر سے دینے کی عادت ڈالیں۔ تحریر کا جواب تحریر سے دینے کے بجائے عوام کو مشتعل کرنے والی تقاریر کرنا یا تو جہالت ہے اور یا پھر کام چوری۔

جلوسہائے عزا کی بحالی اور دین فہمی

۱۹۷۷ء میں عزاداری کے جلوسوں پر شہر لکھنؤ میں پابندی عائد ہوئی سیکڑوں برس سے مرکز عزا لکھنؤ میں شارع عام پر نام حسین لینے پر پابندی لگ سکتی ہے یہ شاید کسی کے وہم وگمان میں نہ رہا ہوگا۔ مگر تقریباً تیرہ برس سے اس تلخ حقیقت کا سامنا ہم لوگوں کو کرنا پڑ رہا ہے۔

علی کانگریس نے عزاداری کے جلوسوں کی بحالی کے لیے مختلف انداز سے جدوجہد کی۔ متعدد بار دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی کی گئی۔ کرفیو بھی توڑا گیا، مختلف جگہوں سے گرفتاریاں دی گئیں مگر شیعوں کو اُن کے مذہبی حقوق سے محروم رکھنے کی پالیسی میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ قوم کی ٹھیکیداری کے نام پر کچھ لوگوں کو حکومت کی قربت حاصل ہوئی۔ کچھ کو ٹھیکے اور پرمٹ مل گئے اور کچھ لوگوں کو مخبری اور دلالی کے عوض تھوڑی بہت منفعت حاصل ہوگئی۔

چند سال قبل ۸ ربیع الاوّل کو جلوسہائے عزا کی بحالی کے لیے مختلف جگہوں سے احتجاجی گرفتاریوں کا اعلان کیا گیا تھا۔ اعلان کے مطابق گرفتاریاں ہوئیں مگر روضہ کاظمین پر یہ افسوسناک واقعہ پیش آیا کہ نہ صرف وہاں سے گرفتاریوں کی مخالفت کی گئی بلکہ عزائے حسینؑ کی بقا کے لیے گرفتاریاں پیش کرنے والوں

یہ مضمون پیام نو مورخہ ۲۰ جولائی ۱۹۹۰ء کی اشاعت میں شائع ہو چکا ہے

کو باقاعدہ گالیاں دی گئیں۔

اس افسوسناک واقعہ کے بعد علی کانگریس کے ذمہ داروں کی ایک میٹنگ منعقد ہوئی جس میں یہ طے پایا کہ مقصد سے غفلت اور دین سے بے خبری کے باعث اب اکثریت حسینی اقدام کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ لہٰذا جب تک لوگوں میں دین کا فہم بیدار نہیں ہوتا اور فکری شعور پختہ نہیں ہوتا، کوئی بھی احتجاجی تحریک یا اصلاح معاشرہ کی تدبیر کامیاب نہیں ہو سکتی۔

اس سلسلہ میں ماضی کی کوششوں پر بھی نگاہ ڈالی گئی۔ آل انڈیا شیعہ کانفرنس کا مردہ ہو جانا، سرفراز اخبار کا بند ہو جانا، یتیم خانہ کی رسّہ کشی، اوقاف کی جائداد کی لوٹ اور تباہی، قومی گھر کا بجائے قومی زندگی کا مظہر ہونے کے قوم کی بدحالی کا نشان بن کر رہ جانا، شیعہ کالج کا شیعوں کی تعلیمی پسماندگی دور کرنے کا ذریعہ بننے کے بجائے چند نااہلوں کے پیٹ پلنے کا ذریعہ بن کر رہ جانا، دینی تعلیم کے فروغ کے بجائے روز بہ روز دینی شعور کا فقدان، معاشی پسماندگی دور کرنے والے اداروں کا محض بھیک مانگنے والے پیشہ وروں کی تعداد میں اضافہ کر دینا، مجالس عزا اور صف عزا سے احترام دین کی تعلیم کے بجائے واجبات کا مضحکہ اڑانے والی تقاریر، اتحاد و اخوت کے بجائے قطع رحمی اور بغض و عناد پر مبنی بیانات، علماء و ذاکرین کا سیرت علوی سے سبق حاصل کر کے دنیا سے بے رغبتی اختیار کرنے کے بجائے مال و دولت اور زر و جواہر کے پیچھے دوڑنا، یہ سب وہ علامتیں تھیں جنھوں نے علی کانگریس کو لائحہ عمل تبدیل کرنے پر مجبور کر دیا۔ کیونکہ یہ بات واضح ہو گئی تھی کہ کوئی بھی اصلاحی تحریک بغیر دین فہمی

کے الٹے نقصان کا سبب بن جائے گی۔

دین فہمی کے فروغ کے لیے بنیادی توجہ پیام نو پر دی گئی۔ ساتھ ہی مختلف ذاکرین کرام سے قومی مسائل پر بھی کچھ روشنی ڈالنے کی درخواست کی گئی۔ کچھ ذاکرین کرام نے علی کانگریس کی اپیل پر لبیک کہی مگر کچھ خطیبوں نے منفی انداز اختیار کیا۔ بہر حال دھیرے دھیرے دین فہمی نے تحریر سے تحریک تک کا سفر اختیار کر لیا۔ آج بحمداللہ ملک کے طول و عرض سے آنے والے خطوط اس بات کا اعلان کر رہے ہیں کہ فکری بیداری اور ذہن سازی کی ہماری کوششیں کتنی بارآور ہو رہی ہیں۔

انشاءاللہ جب لکھنؤ میں دین فہمی عام ہو جائے گی اس وقت ہر شخص یہ بات آسانی سے طے کر لے گا کہ ہمیں عزاداری کے ساتھ ساتھ حسینی پیغام بھی دوسروں تک پہنچانا ہے۔ ہم کو دوسروں کو بھی عزاداریٔ امام مظلوم میں شریک کرنا ہے نہ یہ کہ دوسروں کو نام حسینؑ سے متنفر بنانا ہے۔ جب ہم اس وسیع مقصد کو پیش نظر رکھیں گے تو اپنے آپ ہمارے انداز میں تبدیلی آئے گی۔ ہم اپنی روش کا موازنہ اپنے بزرگوں کی روش سے کریں گے۔ ہمارے بزرگوں نے جو انداز عزا اختیار کیا تھا اس میں نہ صرف دوسرے مسلک کے مسلمان بلکہ ہندو، سکھ اور عیسائی تک شریک ہوا کرتے تھے۔ آج ہم کو سنجیدگی کے ساتھ یہ غور کرنا ہے کہ ہماری روش میں کہاں سے کجی آئی۔

ہم لوگوں نے جب اس سوال پر غور کیا تو اسی نتیجہ پر پہنچے تھے کہ ہمارے ذاکرین اور خطبار کی بڑی تعداد منبر کی ذمہ داریوں اور صفِ عزا کے احترام

کے تقاضوں کو پورا نہیں کر رہی ہے۔ اسی لیے ہماری جانب سے احترام منبر کے لیے تحریک چلائی گئی۔ آج عزاداری کی بحالی کے لیے ضروری ہے کہ دین فہمی عام ہو اور احترام منبر کا شعور ذاکرین، سامعین اور بانیان مجالس سب ہی میں بیدار ہو۔

ہماری ان تمام افراد سے کہ جن کو اللہ نے علم کی دولت سے نوازا ہے، یہ گذارش ہے کہ وہ ہماری تحریروں کو تنقیدی نگاہ سے پڑھیں۔ جن باتوں کو مناسب خیال کریں انھیں اپنے حلقۂ اثر میں بہتر طریقہ پر پیش کریں اور ان کے نزدیک جہاں ہم سے لغزشیں ہوئی ہیں تو برائے مہربانی ہماری اصلاح فرمائیں۔

ہم آپ سے خاص طور پر تعاون کی اس لیے درخواست کر رہے ہیں کہ مسئلہ صرف عزاداری کے جلوسوں تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ ہم لوگ وہی خطرات آج صفِ عزا کے لیے بھی محسوس کر رہے ہیں جن سے کل جلوسہائے عزا دوچار ہو چکے ہیں۔ اگر آپ بھی ہمارے ہم خیال ہیں تو برائے مہربانی عمل کے میدان میں بھی ہمارے ساتھ آئیے۔ علی کانگریس کے ممبر بن کر اصلاح معاشرہ کے لیے منظم جدوجہد کیجیے۔

حج بیت اللہ اور سعودی حکومت

شریعت نے ہر صاحب استطاعت پر زندگی میں ایک دفعہ حج کی ادائیگی کو واجب قرار دیا ہے۔ اور جو شخص استطاعت کے باوجود بغیر کسی عذر شرعی کے حج ادا نہ کرے اور مر جائے تو احادیث میں وارد ہوا ہے کہ ایسا شخص مشرک کی موت مرے گا۔ حج کے فرض ہونے کے علاوہ بھی ہر مسلمان کے دل میں ان مقامات مقدسہ کی زیارت کی تڑپ رہتی ہے کہ جہاں انبیائے کرام، ائمۂ طاہرین علیہم السّلام و دیگر اکابرین نے عبادتیں انجام دی ہیں اور جو ہمارے لیے قبلہ قرار دیا گیا ہے۔ مکّہ مکرّمہ کی ہی طرح مدینہ منورہ کی بھی خصوصی اہمیت ہے۔ وہاں مسجد نبوی ہے۔ رسول اکرمؐ کی آخری آرام گاہ، امام حسن علیہ السّلام امام زین العابدین علیہ السّلام، امام محمد باقر علیہ السلام، امام جعفر صادق علیہ السّلام اور جگر گوشۂ رسول جناب فاطمہ زہرا صلوٰۃ اللہ علیہا کی قبور ہیں اور پتہ نہیں کتنے اکابرین ملت وہاں محوِ خواب ہیں۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اخلاق کریمانہ کے تذکرے سننے اور ان مقامات مقدسہ کی زیارت کے شوق کے ساتھ جب کوئی شخص حج کے لیے عازم سفر ہوتا ہے تو اسے یہ گمان بھی نہیں ہوتا کہ سرزمین عرب پہنچنے

یہ مضمون پیام نو مورخہ ۱۰/ اگست ۱۹۹۰ء کی اشاعت میں شائع ہو چکا ہے۔

کے بعد اس کو کتنی دشواریوں کا سامنا کرنا ہوگا اور کتنی توہین برداشت کرنا پڑے گی۔

جدہ پہنچتے ہی پابندیوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ حاجی کو اس بات کا بھی اختیار نہیں رہ جاتا کہ وہ پہلے مکہ جائے یا مدینہ جائے۔ جس طرح خانۂ قید ہوتی ہے اُسی طرح وہ ایک شہر میں قید کر دیا جاتا ہے۔ اس کا پاسپورٹ اس سے لے لیا جاتا ہے اور وہ شہر سے باہر نہیں نکل سکتا۔ معلّم حضرات بہت بدتمیزی سے پیش آتے ہیں۔ راقم الحروف مکہ مکرمہ میں ایک حاجی اور ایک معلّم کی ہاتھا پائی کا چشم دید گواہ ہے۔ اُن حاجی صاحب کے کسی عزیز کی طبیعت بہت خراب تھی اور وہ اس کو جدّہ لے جانا چاہتے تھے۔ مگر چونکہ پاسپورٹ معلّم کے پاس تھا جس کے بغیر مکّہ کے باہر نہ جانے دیا جاتا لہٰذا وہ معلّم سے درخواست کر رہے تھے کہ پاسپورٹ دے دیا جائے مگر معلّم نے کوئی سنوائی نہیں کی الٹے بدتمیزی کا لہجہ اختیار کیا جس کے نتیجہ میں جھگڑا ہوا۔

معلّم حضرات کی بے توجہی اور حاجیوں کو مختلف انداز سے لوٹنا (غیر معیاری رہائش گاہیں لمبے کرایہ پر دینا، بسوں کے انتظام میں گڑبڑیاں وغیرہ) تو مشہور ہیں۔ سب سے افسوسناک پہلو حرم میں تعینات سپاہیوں اور محافظوں کا حاجیوں کے ساتھ بدتمیزی کا رویہ اپنانا ہے۔ چنانچہ جس شخص نے بھی حج کیا ہے اس نے یہ افسوسناک منظر دیکھا ہوگا کہ کس طرح وہاں کے محافظ حجرِ اسود کو بوسہ دینے والوں کو دھکا دیتے یا مارتے ہیں۔ یہی منظر مسجد نبوی میں روضۂ رسولؐ کے پاس دیکھنے میں آتا ہے کہ جہاں روضۂ رسولؐ

کی جالی چھونے والوں یا زیارت پڑھنے والوں کے ساتھ بدتہذیبی کی جاتی ہے۔
امسال میرے ایک جاننے والے ڈاکٹر صاحب کے ساتھ یہ افسوسناک واقعہ پیش آیا کہ وہ روضۂ رسولؐ کے پاس نماز پڑھ رہے تھے، ان کو ہاتھ کھول کر نماز پڑھتے دیکھ کر ایک محافظ باقاعدہ لڑنے لگا۔ کہنے لگا "شیعہ شیعہ، لاحول ولاقوۃ، لاحول ولاقوۃ"۔

سعودی کارندوں کی بدتمیزیوں کے خلاف ایران ایک عرصہ سے آواز بلند کر رہا تھا۔ ایک سازش کے تحت سعودی حکومت نے تین سال قبل اس آواز کو خاموش کرنے کے لیے خونیں کھیل کھیلا اور سیکڑوں بے گناہ حاجیوں کو شہید کر دیا تھا۔ اپنی اس عیارانہ چال پر سعودی حکمرانوں کو زیادہ عرصہ تک خوش ہونے کا موقع نہ مل سکا اور اس سال منیٰ میں ہونے والے حادثہ نے پوری دنیا کے مسلمانوں کی آنکھیں کھول دیں۔

منیٰ کے پاس ایک ٹرمنل میں ہزاروں حاجیوں کے شہید ہونے کی تفصیلات اب منظرِ عام پر آگئی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ سعودی حکام کا رویّہ کتنا ظالمانہ ہے۔ چشم دید گواہوں کے مطابق جس وقت ٹرمنل میں موجود حاجیوں نے نعرۂ تکبیر بلند کیا تو سعودی حکام نے یہ سمجھ کر کہ اس ٹرمنل میں حکومت کے خلاف کوئی مظاہرہ ہو رہا ہے، وہاں کی لائٹ بند کر دی جس سے ہوا کو پھینکنے والے پنکھے بھی بند ہو گئے۔ لوگوں کا دم گھٹنا شروع ہوا۔ لوگوں نے سرنگ کے باہر نکلنا چاہا تو اُن پر سپاہیوں نے حملہ کیا۔ اس طرح کچھ لوگ دم گھٹ کر، کچھ لوگ کچل کر اور کچھ لوگ سپاہیوں کے حملہ کی وجہ سے مارے گئے۔ جب سرنگ کے باہر موجود کچھ افراد نے زخمیوں اور جاں بلب افراد کی مدد کرنی چاہی تو

سپاہیوں نے اُن لوگوں پر بھی حملہ کیا۔ زخمیوں اور لاشوں کو کوڑے کی طرح ٹرکوں میں بھر کر لے جایا گیا۔ سرکاری خبروں میں اس سانحہ میں ہلاکین کی تعداد تقریباً ڈیڑھ ہزار بتائی گئی ہے۔ مگر غیر سرکاری خبروں کے مطابق ۶ ہزار سے ۸ ہزار کے درمیان حجاج کرام جاں بحق ہوئے ہیں۔

اس سانحہ کے بعد سے مختلف مسلم ممالک اور تنظیموں نے حرمین شریفین کا انتظام کسی بین الاقوامی کمیٹی کے سپرد کرنے کی ایرانی تجویز کو دہرایا ہے۔

ہماری زندگی

انسان اور جانور کی زندگیوں میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ حیوان کا حافظہ نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے۔ وہ ماضی کے ناخوش گوار واقعات کو یاد نہیں رکھتا اور اس لیے مستقبل کے لیے کسی پیش بندی سے قاصر رہتا ہے۔ جبکہ انسان کو اللہ نے قوت حافظہ اور قوت متخیلہ سے نوازا ہے۔ انسان ماضی کے تجربات اور حال کے تجزیے کی بنیاد پر مستقبل کے خطرات کا اندازہ لگا سکتا ہے اور بدنما صورت حال کا مقابلہ کرنے کی تیاری کر سکتا ہے۔

اس وقت جو حالات ہمارے ملک کے ہو رہے ہیں اور جس انداز سے فرقہ وارانہ مخالفت کا لاوا ابل رہا ہے اور فسادات کے دوران پولیس اور پی۔ اے۔ سی۔ کا رول رہا ہے وہ ہر ہوشمند کو یہ باور کرانے کے لیے کافی ہے کہ اس کی جان، مال و آبرو کسی وقت بھی خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ اسی طرح بڑھتی ہوئی لاقانونیت، غنڈہ گردی اور سماجی ناانصافی معاشرہ میں زہر گھول رہے ہیں۔ ہمارا معاشرہ ظلم کا معاشرہ ہے اور یہ توقع کرنا کہ اس ظلم و فساد کے ماحول میں ہم پرسکون زندگی گذار سکیں گے محض حماقت ہے

سوال اس بات کا ہے کہ اس عالم میں ہم کیا کریں؟ کیا کوئی طریقۂ کار ایسا

یہ مضمون پیام نو مورخہ ۱۷/ اگست ۱۹۹۰ء کی اشاعت میں شائع ہو چکا ہے

ہوسکتا ہے کہ موجودہ حالات میں بہتری لائی جاسکے؟

اس کے لیے پہلی چیز اللہ پر بھروسہ رکھنا ہے کہ جو خدا اس بات پر قدرت رکھتا ہے کہ کھٹی کیری کو پکے آم میں بدل دے وہ خدا فاسد معاشرہ کو صالح معاشرہ میں بھی بدل سکتا ہے۔ شرط صرف اتنی ہے کہ اللہ کے مقرر کردہ اصول وضوابط کی پابندی کی جائے۔ اگر ہم کو اپنی اور اپنے اہل وعیال کی جان، مال اور آبرو عزیز ہے اور ہم اپنی آئندہ نسلوں کے لیے سکون اور اطمینان کی زندگی چاہتے ہیں تو ہم کو خواب غفلت سے بیدار ہونا ہوگا۔ ہمیں اپنی دوہری ذمہ داری کو یاد کرنا ہوگا یعنی

پہلی ذمہ داری یہ کہ ہم خود راہِ ایمان پر گامزن رہیں ــــ اور

دوسری ذمہ داری یہ کہ ہم دوسروں کو بھی ایمان کی دعوت دیں۔

اگر ہم اس الٰہی ذمہ داری کو پورا کریں گے تب ہی ہم کو عزت اور سربلندی حاصل ہوگی۔ حضرت علی علیہ السلام نے ابن ملجم کی تلوار سے زخمی ہونے کے بعد اور شہادت سے قبل جو وصیتیں فرمائی ہیں اُن میں ایک وصیت یہ بھی ہے کہ "دیکھو! تم امر بالمعروف ونہی عن المنکر ترک نہ کرنا۔ اگر تم امر بالمعروف ونہی عن المنکر ترک کردوگے تو بدترین لوگ تم پر مسلط ہوکر حکومت کریں گے اور جب بدترین لوگ تم پر حکومت کریں گے تو تم جو بھی دعا مانگو گے اللہ اسے قبول نہیں کرے گا۔"

افسوس کہ آج خود شیعوں نے امام کی اس وصیت کو بھلا دیا۔ آج شیعہ معاشرہ میں جس طرح سے بدگمانی، بدی، غیبت اور گالم گلوج کا بازار گرم ہے کیا کوئی تصور کرسکتا ہے کہ یہ شیعہ قوم اس ملک ہندوستان میں بسنے والے لوگوں

کی رہبری کر سکتی ہے ؟ کیا ہم لوگ بغیر اپنے قومی حالات کی اصلاح کیے ہوئے دیگر مذاہب کے لوگوں کو اسلامی اقدار اور معصومین علیہم السلام کے اعلیٰ اخلاق سے متعارف کرا سکتے ہیں ؟

آپ نے اخبار میں یہ خبر پڑھی ہو گی کہ دسہرے کے موقع پر تقریباً پانچ لاکھ ہندو بدھ مذہب اختیار کر لیں گے۔ یہ خبر ہندوؤں سے زیادہ مسلمانوں کے لیے تازیانۂ عبرت ہے کہ آج ہندوستان کا مسلمان اس لائق نہیں رہ گیا ہے کہ وہ اسلام کو عملی طور پر اس طرح پیش کر سکے کہ لوگ اسلام کو بدھ مت پر ترجیح دیں اور پھر عام مسلمانوں کے مقابلہ میں شیعوں کے لیے زیادہ عبرت کا مقام ہے کہ وہ آج بھی اس لائق نہیں ہیں کہ اہل بیت علیہم السلام کی تعلیمات کو اقوام عالم کے سامنے پیش کر سکیں اور لوگوں کو دین حق سے روشناس کرا سکیں۔

ایسا کیوں ہے ؟

اگر آپ غور کریں تو آپ کو معلوم ہو گا کہ ہم نے دین کا غلط تصور عوام کے سامنے پیش کیا۔ ہم نے کبھی یہ بات لوگوں کو بتائی ہی نہیں کہ تمھیں خود بھی اہلِ بیت علیہم السلام کی تاسی کرنی ہے۔ اگر شیعوں کو یہ بتایا جاتا کہ ان کو رسولؐ اور آلِ رسولؐ کی سیرت کی روشنی میں اس طرح عملی زندگی گزارنی ہے کہ لوگ اپنے آپ حقیقی اسلام سے متعارف ہو جائیں تو شاید آج ہندوستان کا نقشہ کچھ اور ہوتا مگر یہاں تو دین نہ ہوا کرکٹ کا کھیل ہو گیا۔ جس طرح کرکٹ کے کھیل میں کھلاڑی تو بائیس ہوتے ہیں مگر تماشائی ہزاروں ہوتے ہیں۔ کھلاڑیوں کا کام کھیلنا اور تماشائیوں کا کام اپنے پسندیدہ کھلاڑی کے اچھے کھیل پر خوش ہونا، تالیاں

پیٹنا اور اس کے ہار جانے پر غم و غصہ کا اظہار کرنا ہوتا ہے۔ وہی نظریہ ہم نے دین پر منطبق کر دیا۔ ہمیں خود عمل نہیں کرنا ہے بلکہ بے عملی کے ساتھ دوسرے کے عمل کی تعریف یا تنقید کرنی ہے۔

آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم دین کے بارے میں اپنے تصور کو درست کریں۔ جناب غلام علی گلزار صاحب نے کشمیر کے نوجوان ساتھیوں کو کیا ہی اچھا نعرہ دیا ہے: "اندھیروں کو کوسنے سے بہتر ہے کہ ایک شمع روشن کر دی جائے"۔ بحمد اللہ پیام نو کی صورت میں جو شمع روشن کی گئی تھی آج اس کی روشنی دور دور تک پھیل رہی ہے۔ ہمیں یقین کامل ہے کہ وہ دن دور نہیں کہ جب منبر کا احترام پوری طرح بحال ہوگا اور ایسی تقاریر ہوں گی جو افراد قوم میں باہمی اُلفت اور دین فہمی کو بڑھاوا دینے والی ہوں گی جس کے نتیجے میں ہمارا معاشرہ مثالی معاشرہ بن جائے گا اور دوسروں کے لیے نمونہ قرار پائے گا۔ آمین

یزید کی غیبت؟

ایک دل چسپ مراسلہ ہم کو جناب سید محمد حیدر نقوی صاحب، اسٹار ٹی سینٹر، کاظمین روڈ، لکھنؤ، کا موصول ہوا ہے جس میں علی کانگریس کے ایک ہینڈ بل کے ایک جملے کو بنیاد بنا کر سات سوال تحریر فرمائے ہیں۔

علی کانگریس کے اس ہینڈ بل کا جملہ یہ ہے:

"کیا یزید کو شراب خوار اور زنا کار کہتے وقت ہمارے ذہن میں یہ بات رہتی ہے کہ معصومین علیہم السّلام نے غیبت کو زنا سے بدتر قرار دیا ہے۔"

اب سید محمد حیدر نقوی صاحب کے سوالات پیش خدمت ہیں:

سوال (۱) کیا آپ کی اس تحریر سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ یزید کو برا کہنا غیبت ہے؟

جواب:۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ یزید کو شراب خوار اور زنا کار کہنا یزید کی غیبت کرنا نہیں ہے کیونکہ یزید نے ان اعمال قبیحہ کا ارتکاب علانیہ کیا تھا۔ اگر ایسے ظالموں کا تذکرہ کرنا غیبت ہوتا تو پھر قرآن میں قابیل، فرعون، قوم لوط، پسر نوح و دیگر ظالموں کے تذکرے نہ ہوتے۔ ہمارے نزدیک یزید ظالموں کے اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

یہ مضمون پیام نو مورخہ ۲۴/اگست ۱۹۹۰ء کی اشاعت میں شائع ہو چکا ہے

ہمارے جملے کا مفہوم یہ ہے کہ شیعہ معاشرہ میں غیبت کو نہیں پنپنا چاہیے۔ کیونکہ غیبت ایک گناہ کبیرہ ہے اور احادیث معصومینؑ کی روشنی میں غیبت زنا سے بدتر گناہ ہے۔ لہٰذا جب ہم یزید کی برائیوں کا ذکر کریں تو ہمیں یہ بھی ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے کہ ہم یزید سے بڑھ کر گناہوں کا ارتکاب نہ کریں۔ میں یہ بھی واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ جو شخص یزید کو شراب خوار اور زنا کار کہنا یزید کی غیبت کرنا قرار دے وہ یزیدی ہے۔

جن لوگوں نے ہمارے الفاظ کو غلط معنی پہنائے ہیں انھوں نے بدگمانی کا ارتکاب کیا ہے۔ سورہ حجرات میں ارشاد الٰہی ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اجْتَنِبُوا كَثِيرًا مِّنَ الظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ وَلَا تَجَسَّسُوا وَلَا يَغْتَب بَّعْضُكُم بَعْضًا أَيُحِبُّ أَحَدُكُمْ أَن يَأْكُلَ لَحْمَ أَخِيهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوهُ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ تَوَّابٌ رَّحِيمٌ ○ (سورہ حجرات آیت ۱۲)

"اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، زیادہ گمانوں سے پرہیز کرو کیونکہ بعض گمان گناہ ہیں، اور آپس میں ایک دوسرے کے حال کی ٹوہ میں نہ رہا کرو، اور نہ تم میں سے ایک دوسرے کی غیبت کرے، کیا تم میں سے کوئی اس بات کو پسند کرے گا کہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے؟ پس تم اس کو ناپسند کرو گے۔ بے شک اللہ توبہ قبول کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔"

یہیں پر مناسب ہوگا کہ حضرت علی علیہ السلام کا ایک قول بھی پیش کر دیا

جائے۔ فرماتے ہیں:

"کسی کے منہ سے نکلنے والی بات میں اگر اچھائی کا پہلو نکل سکتا ہو تو اس کے بارے میں بدگمانی نہ کرو۔"

(حوالہ نہج البلاغہ مطبوعہ بمبئی ص۹۲۲)

سوال (۲) اگر آپ نے یہ سوچا کہ میری لکھی تحریر کو جاہل نہیں سمجھ سکتا تو قوم کے ایک مجتہد نے بھی غلط بتایا ہے۔ کچھ روشنی ڈالیں۔

جواب: میں نے "کیا سوچا؟" یہ آپ کو کیسے معلوم ہوا؟ حضرت علی علیہ السّلام نے فرمایا ہے:

"یہ انصاف نہیں ہے کہ صرف ظن و گمان پر اعتماد کرتے ہوئے فیصلہ کیا جائے۔" (حوالہ نہج البلاغہ مطبوعہ بمبئی ص۸۱)

ہمارے علم میں لکھنؤ میں کوئی باقاعدہ مجتہد نہیں ہے۔ لہٰذا آپ برائے مہربانی اُن مجتہد صاحب کا نام تحریر فرمائیں اور ان کے اس فتوے کی نقل بھی ارسال فرمادیں جس کے مطابق یزید کو شراب خوار اور زنا کار کہنا غیبت ہے۔

مہربانی فرما کر اُن مجتہد صاحب کو حضرت علی علیہ السّلام کا یہ ارشاد گرامی بھی یاد دلادیں:

"ایک بدطینت شخص اپنے بھائی کے متعلق نیک گمان نہیں رکھتا (اور ہمیشہ اس کے بارے میں بدگمان رہتا ہے) کیونکہ انسان ہر ایک کو اپنی فطرت کے مطابق سمجھتا ہے۔" (حوالہ غرر الحکم ج۱ ص۸)

سوال (۳) آپ نے ایسی تحریر کیوں لکھی جسے عام طور پر لوگ سمجھنے سے قاصر ہیں؟

جواب: آپ کی بات درست نہیں ہے۔ تقریباً ہر شیعہ جو سمجھ رکھتا ہے وہ ہماری تحریریں سمجھ لیتا ہے۔ صرف وہی لوگ کہ جو یزیدی ذہنیت رکھتے ہیں یا جن کے پیٹ مالِ حرام سے بھرے ہیں سمجھ کر بھی ناسمجھ بنتے ہیں۔

سوال (۴) کیا ہمارے کم علمی معاشرے میں ایسی عبارت لکھنا درست ہے؟

جواب: آپ نے شیعہ معاشرہ کو "کم علمی معاشرہ" کہہ کر حقیقت پسندی کا ثبوت دیا ہے۔ جب آپ معاشرہ میں پھیلی جہالت کا اعتراف کر رہے ہیں تو پھر آپ ہی بتائیے، علم کیسے پھیلے گا؟ علمی گفتگو سے یا جاہلانہ تقاریر سے؟ ہمارے نزدیک "کم علمی معاشرہ" میں اشاعت علم کی ہر کوشش نہ صرف یہ کہ درست ہے بلکہ واجب بھی ہے۔

سوال (۵) کیا یزید کی ہی مثال دینا ضروری تھی۔ آپ کی اس عبارت کا مقصد کیا تھا واضح فرمائیں۔

جواب: ۱۱ رمحرم کو تقسیم ہونے والے ہینڈ بل میں اگر کسی بدترین شخص کے فسق وفجور کا تذکرہ بطور عبرت کرنا ہو تو یزید کے علاوہ اور کس کا نام لیا جاسکتا ہے کہ جس کے فاسق و فاجر ہونے پر ہر مؤرخ اور ہر مسلمان متفق ہو؟ عبارت کا مقصد آپ پر واضح ہو چکا ہوگا کہ ہم کو یزید کے گناہوں کے تذکرے کے ساتھ اپنے نفس کا بھی محاسبہ کرتے رہنا چاہیے کہ کہیں خدانخواستہ ہم خود اس گناہ یا اس سے بھی بڑے گناہ کے مرتکب تو نہیں ہو رہے ہیں؟

سوال (۶) کیا آپ نے یہ سوچا تھا کہ ایسی عبارت سے غیر شیعہ پر کیا اثر پڑے گا؟

جواب: ہمارے پیش نظر احکام الٰہی اور معصومین علیہم السّلام کے ارشادات رہتے ہیں جن کی روشنی میں ہم اپنی شرعی ذمہ داری کو پورا کرتے ہیں۔ کس پر کیا اثر ہو گا اس کی ذمہ داری ہم پر نہیں ہے۔ اشاعت علم کی نوعیت بارش کے قطرات کی ہے کہ جو اگر سیپ میں پڑے موتی بن جائے۔ زرخیز زمین پر پڑے تو فصل کو فائدہ پہنچے۔ کسی پیاسے تک پہنچے تو اس کی پیاس بجھائے اور اگر کسی کوڑے کے ڈھیر یا گھورے پر گرے تو بدبو پھیلے۔ یہ اپنے اپنے نفس کی بات ہے نہ بارش کا قصور ہے اور نہ پانی برسانے والے کا قصور۔

سوال (۷) کیا آپ اس طرح کی تحریریں اصلاح کے لیے ضروری سمجھتے ہیں؟

جواب: جی ہاں۔ اگر ضروری نہ سمجھتے ہوتے تو کیوں لکھتے؟ قرآن کریم کی وہ آیتیں جو سب سے پہلے رسول اکرمؐ پر بصورت وحی نازل ہوئی ہیں یعنی سورہ اِقْرَأْ کی پہلی پانچ آیتیں ان کو آپ پڑھیں تو آپ کو معلوم ہو گا کہ پہلی ہی وحی میں علم اور قلم کی بات کی گئی ہے۔ یعنی یہ اشارہ ہے اصلاح کے لیے تحریر کی اہمیت کا۔

ہم آپ سے گزارش کرتے ہیں کہ جس طرح آپ نے ۱۱ر محرم والے ہینڈبل کو پڑھا ہے اسی طرح پوری کتاب دین فہمی کا بھی مطالعہ فرمائیں اور جو بات آپ کی سمجھ میں نہ آئے اس کو بغیر کسی تکلف کے ہم سے دریافت فرمائیں۔ ہم نے متعدد بار اعلان کیا ہے کہ ہماری تحریریں آیاتِ قرآنی، ارشادات معصومینؑ اور جلیل القدر شیعہ علمائے دین کی تحریروں کی روشنی میں لکھی جاتی ہیں۔ ہم آج بھی آپ کو دعوت دیتے ہیں کہ آپ بجائے لکھنؤ کے بقلم خود مجتہدین کے حکم

میں پڑنے کے ایران و عراق کے حقیقی علماء سے رجوع کریں۔

جب آپ کتاب دین فہمی کا مطالعہ کریں گے تب آپ کو یہاں کے بعض بے عمل علماء سُو اور کچھ مفسد ذاکرین کی اس سازش کا علم ہوگا جو انھوں نے اپنے کالے کرتوتوں پر پردہ ڈالنے کے لیے ہمارے خلاف رچی ہے۔ آج قوم کے سامنے کتنے مسائل ہیں۔ ان مسائل کے سلسلے میں علی کانگریس نے کیا کیا اور کیا کہا ہے اس کو آپ ایک کاغذ پر لکھیے اور دوسرے کاغذ پر ان بے عمل علماء اور مفسد ذاکرین نے ان مسائل پر جو کچھ کہا اور جو کچھ کیا ہے اس کو لکھیے تو آپ پر حقیقت خود ہی روشن ہو جائے گی۔ یہ لوگ نہ خود کچھ کرنا چاہتے ہیں اور نہ دوسرے کو کچھ کرنے دینا چاہتے ہیں۔

اوقاف کی جائدادیں لٹ رہی ہیں مگر یہاں کے بعض نقلی مجتہدین نہ صرف یہ کہ خاموش ہیں بلکہ اوقاف کے لٹیروں کے ساتھ ساتھ رہتے ہیں۔ یہی حالت مفسد ذاکرین کی ہے کہ کربلاؤں اور درگاہوں کی لوٹ پر یہ ایک لفظ بھی نہیں کہتے۔ کاش علی کانگریس اور دین فہمی کی اندھی مخالفت کرنے کے بجائے یہ اپنا زورِ بیان قومی مسائل کے حل کرنے پر صرف کرتے۔ مگر مسئلہ یہ ہے کہ اگر قوم کے افراد نے دینی امور میں عقل کا استعمال کرنا شروع کر دیا تو ان لوگوں کو بھاگتے راستہ نہیں ملے گا۔ لہٰذا ”لوگوں کو فالتو بحثوں میں الجھا کر اپنا اُلّو سیدھا کیے رہنے“ کی پالیسی پر یہ لوگ عمل پیرا ہیں۔ (مزید معلومات کے لیے کتاب دین فہمی کے صفحہ ۹۰ اسے ۸۲ اتک، پر درج مضمون ”اتحادِ قوم، بے حس علماء اور جاہل ذاکرین“ ملاحظہ فرمائیں۔)

نادان محل روڈ پر واقع "قومی گھر" آل انڈیا شیعہ کانفرنس کے تحت شیعہ قوم کے مرکزی ادارے کی مرکزی عمارت کے طور پر تعمیر ہوا تھا۔ بزرگ حضرات بتاتے ہیں کہ اس "قومی گھر" کی تعمیر کے لیے چندہ جمع کرنے کے لیے شیخ ممتاز حسین صاحب جون پوری مرحوم نے ایک ایک گھر کی کنڈی کھٹکھٹائی تھی۔ بتاتے ہیں کہ عورتوں نے اپنے زیور، گھر کے برتن اور پاندان تک دے دیے تھے۔

مدرسۃ الواعظین کے الواعظ صفدر پریس کی طرح اس قومی گھر کے ایک بڑے حصّے کو بھی کس طرح ایک غیر مسلم کے حوالے کر دیا گیا، اس کی اطلاع آپ کو مل گئی ہوگی۔ شیعہ اوقاف کی جائدادوں کی لوٹ اور تباہی کوئی نئی بات نہیں ہے۔ لیکن اس بار جو اچھی بات دیکھنے میں آئی وہ یہ ہے کہ کچھ نوجوانوں اور سنجیدہ افراد نے "قومی گھر" کی اس لوٹ پر دکھ محسوس کیا اور اس ظلم کے خلاف آواز بلند کی۔ ہم ان نوجوانوں کے جذبات کی قدر کرتے ہیں اور اللہ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ ان مخلص افراد کی توفیقات میں اضافہ کرے تاکہ وہ سمجھ سکیں کہ اس تباہی اور لوٹ کا اصل سبب کیا ہے اور حالات میں بہتری کیسے لائی

یہ مضمون پیام نو مورخہ ۱۳ / اگست ۱۹۹۰ء کی اشاعت میں شائع ہو چکا ہے

جا سکتی ہے؟

جب ہمارے یہ نوجوان غور کریں گے تو ان پر واضح ہو گا کہ جس طرح کسی بیماری کا ایک سبب (CAUSE) ہوتا ہے اور دوسرے اس کے اثرات (SYMPTOMS) ہوتے ہیں اسی طرح قومی زندگی کا حساب بھی ہے۔ مثال کے طور پر اگر کسی شخص کے جسم میں کسی مرض کے جراثیم پہنچ گئے ہیں جس کے سبب سے اس کو بخار ہو گیا ہے تو اس شخص کی بیماری کا سبب وہ جراثیم قرار پائیں گے، بخار اُس مرض کی علامت یا اثر ہو گا۔ اب اگر کوئی ڈاکٹر اس مریض کے مرض کی تشخیص کیے بغیر، محض تیز دواؤں سے بخار گھٹانے کی کوشش کرے گا تو وہ ایک اچھا ڈاکٹر نہیں ہو گا۔ ایک اچھے ڈاکٹر کا کام یہ ہو گا کہ وہ ان جراثیم کا بھی علاج کرے ورنہ ہو سکتا ہے کہ ابھی بخار اتر جائے مگر بعد میں مرض دوبارہ ابھر کر جان لیوا ہو جائے یا دوسری بیماریاں بھی گھر کر لیں۔

چند برس قبل علی کانگریس کی جانب سے اوقاف کے تحفظ کی مہم چلائی گئی تھی۔ اس مہم کے دوران ہم کو بہت سے تلخ تجربات ہوئے۔ اس سلسلے میں وقف سجادیہ (وقف متنی نواب صاحب) کا تذکرہ کافی عبرت ناک ہے۔ ہر دوئی روڈ پر اس وقف کا امامباڑہ ہے جس میں دو جھاڑ فانوس تو ایسے ہیں کہ چھوٹے امام باڑے میں بھی نہیں ہیں۔ یہ امام باڑہ برسوں سے بند پڑا تھا اور اس میں مراسم عزاداری بھی انجام نہیں دیے جا رہے تھے۔ وقف بورڈ کی مقرر کردہ کمیٹی میں سے کسی کی ہمت نہیں تھی کہ اس امامباڑے میں داخل بھی ہو سکتا۔ علی کانگریس کے ممبران نے اس امام باڑہ کو کھلوایا اور پورا چارج وقف بورڈ

کی کمیٹی کے منتظم متولی کو دلوایا اور یہ کہا کہ اس کمیٹی کی نو تشکیل کرا کر ایسے افراد کو ممبر بنوائیے کہ وقف کا انتظام بہتر ہو سکے۔ مگر وقف بورڈ نے جب اس کمیٹی کی تشکیل کی تو اس میں ایسے بدنام چہروں کو شامل کیا گیا کہ یہ اُسی وقت واضح ہو گیا کہ اگر امام باڑہ بند ہی رہتا تو بہتر تھا اور ابھی خبر ملی ہے کہ اس وقف کی جائدادیں بکنے لگی ہیں۔

ہم لوگوں نے جب حالات کا تجزیہ کیا تو اسی نتیجہ پر پہنچے کہ کسی مخصوص جائداد کو اگر ہم آج بچا بھی لیں تو کل وہی جائداد اس سے بھی بڑے بے ایمان کے ہاتھ میں پہنچ جائے گی۔

آج ہماری قوم بیمار ہو گئی ہے، کمزور ہو گئی ہے، مگر ہماری جائدادوں کی تباہی، ہماری اقتصادی بدحالی اور ہماری تعلیمی پسماندگی وغیرہ اصل مرض نہیں ہیں، بلکہ یہ مرض کی علامت ہیں۔ یہ اس بات کی نشانی ہے کہ ہم اللہ کی نافرمانی میں مبتلا ہیں۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ہم اللہ اور اس کے رسول کے بتائے ہوئے راستے سے بھٹک گئے ہیں اور ہم معصومین علیہم السلام کا صحیح طریقہ سے اتباع نہیں کر رہے ہیں۔

آج شیعوں کی جائدادوں کا غیروں کے ہاتھ میں چلا جانا اللہ کے اسی اٹل قانون کے تحت ہے جو اس نے ازل سے مقرر فرما دیا ہے اور وہ قانون یہ ہے کہ جب کوئی قوم اللہ کی اطاعت و فرماں برداری اختیار کرے گی تو اس کو عزت و سربلندی حاصل ہو گی اور جب کوئی قوم اللہ کی نافرمانی کرے گی تو اس کو دی ہوئی نعمتیں چھن جائیں گی اور دنیا و آخرت دونوں ہی میں وہ ذلیل و خوار

ہو گی۔ سورۂ انفال کی ۵۲ ویں و ۵۳ ویں آیات میں ارشاد ہوا:

كَدَأْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ كَفَرُوْا بِاٰيَاتِ اللهِ فَاَخَذَهُمُ اللهُ بِذُنُوْبِهِمْ اِنَّ اللهَ قَوِيٌّ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ وَاَنَّ اللهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝

"ان لوگوں کی حالت قوم فرعون اور ان سے پہلے والوں کی سی ہے کہ انھوں نے اللہ کی نافرمانی اختیار کی تو اللہ نے بھی ان کو اُن کے گناہوں کے سبب لے ڈالا۔ بے شک اللہ بڑا سخت عذاب نازل کرنے والا ہے۔ اور اس سبب سے کہ اللہ کسی قوم کو دی گئی نعمتوں میں اس وقت تک تبدیلی نہیں لاتا جب تک وہ لوگ خود اپنے میں تبدیلی نہ لائیں۔ اور اللہ تو سب سنتا اور جانتا ہے۔"

یہی حالات تھے کہ جن پر غور کرنے کے بعد علی کانگریس نے یہ طے کیا کہ جب تک افرادِ ملت کا دینی شعور بیدار نہ ہو، جب تک لوگ جذبات میں اندھے ہونے کے بجائے عقل کا استعمال کر کے رہبر اور رہزن، دوست اور دشمن اور بھلے و برے میں تمیز کرنے کے قابل نہ ہو جائیں اس وقت تک نہ تو جلوسہائے عزا کی بحالی کی تحریک سے کوئی نتیجہ حاصل ہو گا اور نہ ہی اوقاف کے تحفظ کی کوئی تحریک بارآور ہو گی۔ لہٰذا پہلے دینی شعور کو بیدار کرنے کے لیے تحریک دین فہمی چلائی جائے۔

جب انشاء اللہ دین فہمی کو فروغ حاصل ہوگا تو لوگ خیام حسینی کی لوٹ پر گریہ کرنے کے ساتھ ساتھ نام حسینؑ پر وقف کی گئی جائدادوں کی حفاظت بھی کریں گے۔ پھر اہلِ حرم کی بے پردگی اور تشہیر کے تذکروں کے ساتھ اپنے معاشرہ میں بڑھتی ہوئی بے پردگی کے سدِّ باب کی بھی فکر کریں گے۔ پھر مصائب حسینؑ کے تذکروں کے ساتھ مقصد حسینی کو بھی پیش نظر رکھیں گے۔ پھر قربانئ حسینؑ سے درس حاصل کرکے حفاظت دین کو اپنے جان و مال پر ترجیح دیں گے پھر یزید کی شراب خواری اور زنا کاری کا ذکر کرتے وقت خود بھی گناہانِ کبیرہ وصغیرہ سے بچنے کی سعی کریں گے اور اس دنیوی زندگی کی چند روزہ لذّتوں پر اُخروی زندگی کی کامیابی کو مقدم قرار دیں گے۔

اور انشاء اللہ جب ایسا ہوگا تب ہم پر اللہ کی رحمتیں پھر نازل ہوں گی اور مسبب الاسباب ہم کو اس سرزمین پر غلبہ واقتدار عطا فرمائے گا۔ آمین۔

اظہارِ بیان اور سوز خوانی

سورہ رحمٰن میں ارشاد رب العزت ہے:

خَلَقَ الْاِنْسَانَ ہ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ہ

"وہ ذات واجب وہی ہے جس نے انسان کو پیدا کیا اور اُسے اپنا مطلب بیان کرنا سکھایا" (سورہ رحمٰن آیت ۳ و ۴)

اگر بہ نظر غائر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اظہار بیان کی صلاحیت ہی کی بنا پر نوع انسانی کو تحریک و ارتقا حاصل ہوئی ہے۔ اپنے جذبات، اپنے خیالات اور اپنی فکر کو ظاہر کرنے اور دوسروں تک منتقل کرنے کی صلاحیت ہی ہے جس سے آنے والی نسلیں گذشتہ نسلوں کے کارناموں اور تجربات سے فیض حاصل کرتی اور شاہ راہِ ترقی پر گامزن ہوتی ہیں۔

آج یہ بلند و بالا عمارتیں، بڑے بڑے کارخانے، پیچیدہ مشینیں، سائنسی انکشافات و تجربات، تحریر و تقاریر، آرٹ و آرکٹیکچر کے شاہکار، یہ سب اسی اظہار بیان کی صلاحیت کے مرہون منت ہیں۔

انسان اپنے مافی الضمیر کو بیان کرنے کے لیے تقریر و تحریر، نظم و نثر، اشارے اور خاموشی، آواز کا اتار چڑھاؤ یا ساز کی مدد، غرضیکہ ہر وسیلہ کو

یہ مضمون، پیام نو مورخہ ۷ رستمبر ۱۹۹۰ء کی اشاعت میں شائع ہو چکا ہے۔

کام میں لاتا ہے۔

کبھی کبھی ایسے واقعات بھی تاریخ انسانی میں رونما ہوتے ہیں کہ جن کے دوررس اثرات زمان اور مکان کی قید سے آزاد ہو کر ہمہ گیریت اختیار کر لیتے ہیں اور جن پر مختلف پہلوؤں سے روشنی ڈالی جاتی ہے۔ ایسے ہی اہم واقعات میں سرفہرست ۱۰ محرم ۶۱ھ یعنی ۱۰ اکتوبر ۶۸۰ء کو عراق میں کربلا کی سرزمین پر رونما ہونے والا وہ المیہ ہے جس کی یاد دنیا کے تقریباً ہر حصے میں منائی جاتی ہے۔

ہندوستان میں عام طور پر اور اودھ میں خاص طور پر یادِ کربلا یعنی عزاداری کو کافی فروغ حاصل ہوا اور امام حسین علیہ السلام کی شخصیت کو اعلیٰ انسانی اقدار کے نمونۂ کامل کی حیثیت سے قبول عام حاصل ہوا۔ یہاں کی گنگا جمنی تہذیب عزاداری امام مظلوم کے لیے کافی سازگار ثابت ہوئی۔ کبھی یادِ کربلا عمارت کی صورت میں ڈھلی تو کربلائیں، امام باڑے اور درگاہیں تعمیر ہوئے۔ کبھی کاغذ، کپڑے، لکڑی اور موم کے پیکر میں آئی تو تعزیے، علم اور ضریحیں بنی۔ کبھی اشعار کے قالب میں ڈھلی تو مرثیہ، نوحہ، سلام بن گئی اور جب الفاظ کی بندش کے ساتھ آواز کے اتار چڑھاؤ سے جذباتِ غم کا اظہار ہوا تو سوز بن گئی۔

سوز خوانی ہندوستان کی ایجاد ہے۔ مشہور ہے کہ عظیم گلوکار تان سین نے سوز خوانی کی ابتدا کی۔ مگر رفتہ رفتہ اس فن نے ترقی کی اور ہر خاص و عام اس کا گرویدہ ہو گیا۔ نوابین اودھ کے دور میں سوز خوانی کو عروج حاصل ہوا۔

عبدالحلیم شررؔ کے مطابق تعزیہ داری کے فروغ میں سوز خوانی کا کافی حصہ ہے۔

اگر آج ہم اس پر غور کریں کہ فن سوز خوانی ہندوستان ہی میں کیوں ایجاد ہوا اور پروان چڑھا تو شاید آج اس فن کے مائل بہ انحطاط ہونے کی وجہ بھی سمجھ میں آجائے۔

آپ ایک بہت چھوٹے بچّے کے طرزِ عمل پر غور کریں جو ابھی زبان کی قید سے آزاد ہے۔ وہ اپنی خواہشات اور ضروریات کا اظہار کرنے کے لیے آواز کے اتار چڑھاؤ اور روتے یا ہنسنے سے کام لیتا ہے پھر جیسے جیسے وہ اپنی زبان سیکھتا جاتا ہے الفاظ کا ذخیرہ بڑھتا جاتا ہے۔ وہ الفاظ کے اتار چڑھاؤ کے مقابلہ میں الفاظ کی ادائیگی سے زیادہ کام لیتا ہے۔ یعنی الفاظ کا ذخیرہ کم ہونے کی صورت میں اُس کمی کو پورا کرنے کے لیے آواز کی بندش سے زیادہ کام لیا جاتا ہے۔

اب اس گفتگو کو سامنے رکھتے ہوئے ہندوستان کے حالات پر نظر کیجیے کہ جہاں مختلف مذاہب کے افراد مختلف علاقوں میں بسنے والے اور مختلف بولیاں بولنے والے لوگ یادِ حسینؑ منانے کے لیے ایک دوسرے کے قریب آئے۔ ایسے ماحول میں اظہارِ غم والم کا ایسا طریقہ کہ جو الفاظ کے کانوں میں ٹکراؤ کے مقابلہ میں براہ راست دلوں میں سوز و گداز پیدا کردے، زیادہ مقبول ہونا ہی چاہیے تھا۔ اسی لیے سوز خوانی کو عروج حاصل ہوا۔ مگر پھر جیسے جیسے فرقہ وارانہ خلیج بڑھتی گئی اور صفِ عزا پر دوسرے مذاہب یا دوسرے فرقے کے افراد کا آنا کم ہوگیا تو سوز خوانی کی قدر کم ہوگئی۔ پھر صفِ عزا پر ذکرِ حسینؑ کے انداز میں تبدیلی آگئی اور گریہ کم اور واہ واہی زیادہ ہونے کا رجحان پیدا

ہو گیا۔ آج فن سوز خوانی کے زوال کے یہ بنیادی اسباب ہیں۔

ہم سب ممبران علی کانگریس کہ جو اس بات پر عقیدہ رکھتے ہیں کہ دین کا فہم کسی خاص طبقہ تک محدود نہیں ہونا چاہیے۔ اس کو عام ہونا چاہیے اسی طرح اس بات پر بھی ایمان رکھتے ہیں کہ یادِ کربلا کو بھی کسی ایک فرقے تک محدود نہیں ہونا چاہیے بلکہ اس کو تمام اقوام عالم تک پہنچانا چاہیے۔ آج عزاداری کے سکڑے ہوئے دائرے میں وسعت لانے کی ضرورت ہے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم عزاداری سے وابستہ فنون کا تحفظ کریں اور اللہ کی عطا کردہ اظہارِ بیان کی گوناگوں صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اس پیغام کو دوسروں تک پہنچانے کی سعی کریں۔

ہم تمام عزادارانِ امام مظلوم سے گذارش کرتے ہیں کہ وہ جب مجالس کا انعقاد کریں تو سوز خوانی کا اہتمام بھی کریں اور دوسری گذارش یہ ہے کہ جب آپ مجالس کا انعقاد کریں تو اپنے جان پہچان کے غیر شیعہ افراد کو بھی ضرور مجالس میں مدعو کریں۔

۹ ربیع الاوّل

آج ربیع الاوّل کی ۸ تاریخ اور ایّام عزا کا آخری دن ہے اور کل ۹ ربیع الاوّل یوم عید ہے۔ اس کو عیدِ زہرا کہتے ہیں۔

عیدِ زہرا کیوں منائی جاتی ہے اور اس کے منانے کا انداز کیا ہونا چاہیے؟ اگر آپ ان سوالات کا جواب چاہتے ہیں تو ہم یہاں دنیائے شیعیت کے نامور عالمِ دین شیخ محمد حسین آل کاشف الغطاء کا جواب پیش کر رہے ہیں۔

ان سے سوال کیا گیا

"ہمیں ربیع الاوّل کے ان دنوں کے بارے میں مطلع فرمائیں جن کو حضرت فاطمہ زہراؑ کی خوشی کے دن کے لیے نسبت دی جاتی ہے اور وہ کیوں کر خوش ہوئیں جبکہ ایک شخص ۲۶ ذی الحجہ کو زخمی ہوا اور ۲۹ ذی الحجہ کو اس کی موت ہوئی اور وہ بھی جناب زہرا سلام اللہ علیہا کی وفات کے بعد تو وہ کیوں کر خوش ہوئیں؟"

آقائے شیخ محمد حسین نے جواب دیا

"قدیم زمانے سے شیعوں میں یہ مشہور و معروف تھا کہ یہ ایام خوشی و مسرت کے ایام ہیں جیسا کہ سید ابن طاؤس اپنی کتاب "الاقبال" میں

یہ مضمون پیامِ نو مورخہ ۲۸ ستمبر ۱۹۹۰ء کی اشاعت میں شائع ہو چکا ہے

ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں "ہم نے عجم اور بعض دیگر برادران کی ایک ایسی جماعت پائی ہے کہ جو اس دن عظیم خوشی و مسرت کا اظہار کرتی ہے یعنی ۹ ربیع الاول کے روز۔ اور ذکر کرتے ہیں کہ یہ دن فلاں کی ہلاکت کا دن ہے اور شیخ صدوق سے منسوب ایک ضعیف روایت کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں۔ لیکن سید ابن طاوس لکھتے ہیں کہ ہم کو کوئی ایسی معتبر روایت نہیں ملی جو اس روایت کی تائید کرتی ہو۔ اس سلسلے میں ہمارا قول ہے کہ غالباً حضرت زہرا کی خوشی کا سبب یہ ہو سکتا ہے کہ ۹ر اور ۱۰ر ربیع الاول کو آپ کے والد حضرت رسالت مآبؐ سے آپ کی والدہ طاہرہ خدیجۃ الکبریٰ کا عقد ہوا تھا اور اس میں شک نہیں کہ حضرت زہراؑ ہر سال اس دن اس عظیم شرف اور خیر کثیر پر فخر کرتے ہوئے خوشی اور مسرت کا اظہار فرماتی تھیں۔ اور اس دن خوشی کا اظہار کرنا ان کے شیعوں میں بطور میراث باقی رہ گیا لیکن وقت کے گزرنے کے ساتھ لوگ خوشی کا اصل سبب بھول گئے اور بعض باتیں گڑھنے والوں نے اس کو غلط موڑ دے دیا ہے۔ اس دن کا نام تو عید زہراؑ لوگوں کے نزدیک باقی رہ گیا لیکن اس کا سبب مجہول ہو گیا۔"

شیخ محمد حسین آل کاشف الغطاء آگے لکھتے ہیں

"لیکن اصل جو کچھ بھی ہو اس دن شیعوں کی خوشی اور مسرت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ دوسروں کو ایذا پہنچائیں یا دوسروں پر ہاتھ سے یا زبان سے جسارت کریں یا دوسروں کو تکلیف دینے والی حرکتیں کریں جیسا کہ نجف کے بعض عوام کرتے ہیں لیکن عقلاء و فضلاء ایسی باتوں سے الگ

ہیں لیکن یہ خبیث شعار بیشتر بلاد شیعہ میں پھیل گیا اور یہ سب باتیں بدترین گناہِ کبیرہ میں سے ہیں۔ اور مسلمان کو ایذا دینا اللہ تعالیٰ سے گویا لڑنا ہے اور ائمہ علیہم السلام کو سخت ایذا دینا ہے اور یہ جناب زہراؑ کے لیے بھی بزرگ ترین مصائب میں سے ہے۔

ہم ان گندی عادتوں کا مقابلہ برسوں سے کرتے چلے آرہے ہیں اور نجف اشرف کے صحن مبارک میں ہم نے لوگوں کو برابر خطاب کیا اور انھیں نصیحتیں کیں یہاں تک کہ یہ منکرات بہت کم ہو گئے اور پہلے کو دیکھتے ہوئے اب بہت معمولی منکرات رہ گئے ہیں۔ میں امید کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کی توفیق سے اس کا اتنا بھی اثر باقی نہ رہے۔ انشاء اللہ۔ بے شک خوشی اور سرور کا مطلب یہ ہے کہ مومنین اپنی مخصوص محفلیں کریں اور اہلِ بیتؑ کا ذکر و مناقب کریں۔ اُن کی شان میں قصائد پڑھیں اور خوش آوازی سے پڑھیں بشرطیکہ اُن کی یہ خوش آوازی غنا کی حد تک نہ پہنچے۔

اللہ سے دعا ہے کہ ہم سب کو نیک اعمال اور دونوں جہاں میں سود مند کاموں کی توفیق دے۔ (محمد حسین آل کاشف الغطاء)

گالیاں بکنا کس سے سیکھا؟

جب کوئی قوم صراطِ مستقیم سے بھٹکتی ہے اور کوئی صحیح رہبر نہیں ہوتا ہے تو وہ بالآخر جہالت و گمراہی کے گڑھوں میں جا گرتی ہے اور ہلاکت اس کا مقدر بن جاتی ہے۔ شیطان اُس قوم کے افراد کو اُن کے برے اعمال بھلے کر کے دکھاتا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں بڑھے چلے جاتے ہیں اور یہ گمان کرتے ہیں کہ وہ نیک اعمال انجام دے رہے ہیں۔

آج یہی کچھ حالات ہماری قوم کے بھی ہیں۔ شرافت، متانت اور سنجیدگی کا ماحول ہمارے یہاں سے رخصت ہو چکا۔ اس کے بجائے ہمارے یہاں گالم گلوج، طعن تشنیع، نفرت اور حسد، بدگمانی، تہمت اور بہتان طرازیوں کو رواج حاصل ہو گیا ہے۔ بلکہ بہت سے افراد تو ایسے ہیں کہ جو اس طرح کی نازیبا حرکات کو عبادت سمجھ کر انجام دیتے ہیں۔ سوال اس بات کا ہے کہ یہ سب باتیں ہمارے یہاں کہاں سے آئیں؟ کس امام نے اس کی تعلیم دی ہے؟

اگر ہم ائمہ معصومینؑ کی سیرت کا مطالعہ کرتے ہیں تو معاملات اس کے ایک دم برعکس پاتے ہیں۔

اہل بیت علیہم السلام پر جو مظالم ڈھائے گئے اس کی بنیاد جس شخص کی

یہ مضمون پیام نو مورخہ ۵ راکتوبر ۱۹۹۰ء کی اشاعت میں شائع ہو چکا ہے

ذات قرار پاسکتی ہے اس کا نام معاویہ ابن ابو سفیان ہے۔ مگر حضرت علی علیہ السلام نے اپنے ساتھیوں کو اس بات سے منع فرمایا کہ وہ معاویہ اور اس کے ساتھیوں کو گالیاں دیں۔ چنانچہ نہج البلاغہ کا خطبہ ۲۰۴ ملاحظہ فرمائیں کہ جب حضرت علی علیہ السلام نے جنگ صفین کے موقع پر اپنے ساتھیوں میں سے چند آدمیوں کو سُنا کہ وہ شامیوں کو گالیاں دے رہے ہیں تو آپ نے فرمایا:

"میں تمہارے لیے اس چیز کو پسند نہیں کرتا کہ تم گالیاں دینے لگو۔ اگر تم ان کے کرتوت کھولو اور ان کے صحیح حالات پیش کرو تو یہ ایک ٹھکانے کی بات اور عذر تمام کرنے کا صحیح طریق کار ہوگا۔ تم گالم گلوج کے بجائے یہ کہو کہ خدایا ہمارا بھی خون محفوظ رکھ اور ان کا بھی، اور ہمارے اور ان کے درمیان اصلاح کی صورت پیدا کر اور انھیں گمراہی سے ہدایت کی طرف لا تاکہ حق سے بے خبر حق کو پہچان لیں اور گمراہی و سرکشی کے شیدائی اس سے اپنا رخ موڑ لیں۔"

اسی طرح امام جعفر صادق علیہ السلام کا وہ واقعہ بہت مشہور ہے کہ جب انھوں نے اپنے ایک قریبی دوست کو یہ دیکھا کہ اُس نے اپنے غلام کو "حرام زادہ" کہا ہے تو امام جعفر صادقؑ کی حیرت کا ٹھکانہ نہ رہا۔ امام نے اپنا ہاتھ بلند کیا پھر زور سے اپنی پیشانی پر مارتے ہوئے فرمایا۔

"سبحان اللہ! تم اس کی ماں کو گالی دے رہے ہو؟ اس کی ماں کو ناجائز کام سے منسوب کر رہے ہو؟ میں یہ خیال کرتا تھا کہ تم ایک متقی اور پرہیزگار آدمی ہو۔ لیکن آج یہ حقیقت کھل کر سامنے

آگئی کہ تمھارے اندر تقوٰی و پرہیزگاری نام کی کوئی چیز نہیں ہے"۔
امام کے اس ساتھی نے کہا یا ابن رسول اللہ! یہ غلام اصلاً سندھی ہے اور اس کی ماں بھی سندھ کی رہنے والی ہے۔ آپ خود ہی واقف ہیں کہ وہ لوگ مسلمان نہیں ہیں۔ پھر اس غلام کی ماں کوئی مسلمان خاتون نہیں کہ میں نے اس پر ناجائز کام کی تہمت لگادی ہے۔ امام نے فرمایا:

"اس کی ماں جو بھی سو تھی۔ ہر قوم میں شادی کا ایک قانون اور مخصوص طریقہ ہوا کرتا ہے۔ اگر اس قوم کے لوگ اپنے قومی قانون اور طور طریقوں کی پیروی کرتے ہوئے شادی کرتے ہیں تو اُن کا عمل زنا قطعی نہیں ہے اور ان کے لڑکوں کو زنا زادہ یا حرام زادہ نہیں شمار کیا جاسکتا"

امام جعفر صادقؑ نے پھر اس شخص کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:
"تم اسی وقت مجھ سے دور ہو جاؤ اور آئندہ میرے ساتھ کبھی نہ آنا"
اس کے بعد امام جعفر صادق علیہ السلام کو اس آدمی کے ساتھ لوگوں نے کبھی نہیں دیکھا۔ ساری عمر گزر گئی مگر ان دونوں کے درمیان علیحدگی اور جدائی برقرار رہی۔

آپ ائمۂ طاہرینؑ کی سیرت اور روش سے آج اپنے محلّوں کے ماحول کا موازنہ کیجیے تو آپ کو زمین اور آسمان کا فرق معلوم ہوگا۔ کیا جس امام نے یہ برداشت نہ کیا کہ ان کا کوئی دوست اپنے غلام کو "حرام زادہ" کہے اور اس سے ہمیشہ کی جدائی اختیار کرلی وہ ہمیں اپنے ساتھ رکھے گا کہ جب ہم اس سے

بھی بدتر گالیاں بکنے کے ماہر ہیں؟ یہ وہ سوال ہے جس پر ہم کو غور کرنا چاہیے۔ امام جعفر صادق علیہ السلام نے گالیاں بکنے کو تقویٰ اور پرہیزگاری کے خلاف قرار دیا ہے۔ آج ہماری قومی زندگی کا ڈھانچہ اس لیے بگڑ گیا ہے کہ ہم خوف خدا اور فکرِ آخرت سے کوسوں دور ہو گئے ہیں۔ ائمۂ طاہرین کے ہم نے صرف نام رٹ لیے ہیں اور ہمیں ان کی تعلیمات سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ شیطان نے ہم کو یہ سمجھا دیا ہے کہ تم چاہے جتنے یزیدی اعمال بجالاؤ تمھیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے جنت میں تم جاؤ گے ہی چاہے تم واجبات الٰہی کا مضحکہ اڑاؤ، اوقاف کی جائدادیں لوٹ کھاؤ، جھوٹ بولو، بہتان لگاؤ، جوا کھیلو، لاٹری کے ٹکٹ خریدو، نفرت پھیلانے والی تقاریر کرو، اپنے مسلمان بھائیوں کو اذیت پہنچاؤ، چاہے جتنی زبان دراز کرو تمھیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔

لیکن اگر ہم قرآن اور ارشادات معصومین علیہم السلام کی روشنی میں غور کریں تو معلوم ہوگا کہ اللہ کے احکام اور رسولؐ اور آلِ رسولؐ کی تعلیمات سے منھ موڑ کر اپنی نفسانی خواہشات کے دھارے میں بہے جانے والے افراد درحقیقت کھلی گمراہی میں مبتلا ہیں۔ ایسی گمراہی کہ جو گمراہوں کو نیکی و ہدایت معلوم ہوتی ہے۔ جس کی مثال یا تو کفار مکہ کے یہاں ملتی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اذیتیں پہنچا کر سمجھتے تھے کہ نیک کام انجام دے رہے ہیں اور یا پھر کربلا کے میدان میں یزیدی لشکر میں ملتی ہے کہ جو آلِ رسولؐ کا خون بہا کر یہ سمجھ رہے تھے کہ بہت نیک کام انجام دے رہے ہیں۔

ہماری اللہ تبارک و تعالیٰ سے یہی دعا ہے کہ وہ ہم سب کی توفیقات میں اضافہ کرے کہ ہم حق و باطل میں تمیز کر سکیں اور دین فہمی کو فروغ حاصل ہو۔ آمین۔

مذہبی گالیاں

سورہ حجرات کی گیارہویں آیت میں ارشاد ہوا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّن قَوْمٍ عَسَىٰ أَن يَكُونُوا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَاءٌ مِّن نِّسَاءٍ عَسَىٰ أَن يَكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ ۖ وَلَا تَلْمِزُوا أَنفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوا بِالْأَلْقَابِ ۖ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوقُ بَعْدَ الْإِيمَانِ ۚ وَمَن لَّمْ يَتُبْ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ۝

"اے لوگو! جو ایمان لائے ہو! نہ مرد دوسرے مردوں کا مذاق اڑائیں، ہوسکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں اور نہ عورتیں دوسری عورتوں کا مذاق اڑائیں، ہوسکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں آپس میں ایک دوسرے پر طعن نہ کرو اور نہ ایک دوسرے کو برے القاب سے یاد کرو۔ ایمان لانے کے بعد بُرے نام سے پکارنا بہت بری بات ہے اور جو لوگ (ان بری حرکتوں سے) باز نہ آئیں تو وہی لوگ ظالم ہیں۔"

ہمارا دین اسلام اس بات کا حکم دیتا ہے کہ مسلمان آپس میں ایمان کے رشتے کا احترام کریں۔ مقدس ترین رشتے کی بنا پر وہ ایک دوسرے کے بھائی

یہ مضمون، پیامِ نو مورخہ ۱۲/اکتوبر ۱۹۹۰ء کی اشاعت میں، شائع ہوچکا ہے

ہیں۔ لہٰذا انھیں اللہ سے ڈرتے ہوئے اپنے آپسی تعلقات کو درست رکھنے کی کوشش کرتے رہنا چاہیے۔ چنانچہ اس آیۂ کریمہ میں ایک دوسرے کا مذاق اڑانے، طعن کرنے، یا کسی کے لیے برے نام کا استعمال کرنا منع کیا گیا ہے اور اس طرح کی حرکتوں کو ایمان کے منافی اور ظلم قرار دیا گیا ہے۔

ایمان کا تقاضہ یہ ہے کہ ایک بھائی دوسرے بھائی کی کوتاہیوں سے چشم پوشی کرتے ہوئے اس کی اصلاح کی کوشش کرے۔ کسی کی تضحیک کرنے، طعن کسنے یا بُرے ناموں سے منسوب کرنے سے معاشرہ میں دھیرے دھیرے اُلفت اور یگانگت کا خاتمہ ہوجاتا ہے اور اس کی جگہ پر بدگمانیاں، نفرت اور نفاق کا ماحول ہو جاتا ہے۔ ظاہر سی بات ہے کہ کسی شخص کی زبان دوسرے کے خلاف بدگوئی کرنے کے لیے اس وقت تک نہیں کھلتی جب تک اس کے دل میں بُرے جذبات کا لاوا خوب پک کر پھوٹ پڑنے کے لیے تیار نہ ہو گیا ہو۔ اس طرح ان جذبات کی پرورش کرنے والا دوسروں سے پہلے خود اپنے نفس کو بدی کا آشیانہ بنا چکتا ہے۔ دھیرے دھیرے یہ باتیں پھیلتی ہیں اور پورا معاشرہ اس برائی کی لپیٹ میں آجاتا ہے۔

اس تضحیک، طعن و تشنیع کی بدترین صورت وہ ہے جو خود مذہب کے نام پہ کی جاتی ہے۔ لکھنؤ میں ۹ ربیع الاول کو ہونے والی محفلوں ہی تک بات محدود نہیں ہے بلکہ مجالس کا انداز بھی یہی ہو گیا ہے۔ چنانچہ قضیہ شہید انسانیت کے بعد جو لعن طعن کی روش ذاکرین نے اپنائی اس نے شیعہ سماج کی چولیں ہلا دیں اور اس نفرت اور بدگمانی کے زہر نے اس طرح ذہنوں میں گھر کر لیا ہے کہ آپسی

اعتماد اٹھ گیا۔ اور اب رفتہ رفتہ ذہنی پراگندگی کی وجہ سے مذہبی موضوعات کی بنیاد پر کتنی "مذہبی گالیاں" بکی جاتی ہیں اس کا اندازہ غالباً ہر ایک کو ہے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ ہمارے یہاں حسینیت کی تبلیغ کم اور یزیدیت کا پروپیگنڈہ زیادہ ہوا ہے اور جس کے برے اثرات ہماری سماجی زندگی سے عیاں ہیں۔

جو حضرات تاریخ سے تھوڑی بہت بھی واقفیت رکھتے ہیں اُن کو معلوم ہے کہ غزوۂ تبوک سے واپسی پر ایک دفعہ شب کی تاریکی میں رسول اکرمؐ پر قاتلانہ حملہ کی کوشش کی گئی تھی۔ جناب حُذیفہ یمانی رسول اکرمؐ کے ناقہ کی مہار پکڑے تھے۔ اتنے میں بجلی کے چمکنے سے حملہ کے لیے آگے بڑھنے والوں کے چہرے دکھائی پڑ گئے اور وہ لوگ فرار ہو گئے۔ مگر رسول اکرمؐ نے اُن افراد کے نام نہیں ظاہر کیے اور جناب حذیفہ یمانی کو بھی منع کر دیا۔ آخر ایسا کیوں؟ کیا ہمارے آج کے ذاکرین اس پر روشنی ڈال سکتے ہیں؟ اگر آپ غور کریں تو معلوم ہو گا کہ معاشرہ کو ذہنی فساد سے بچانے کے لیے ایسا کرنا ضروری تھا۔

بہت سے ذاکرین نے ہمارے خلاف بھی پروپیگنڈہ مہم چلائی۔ کچھ لوگوں نے مخالفت میں پمفلٹ اور ہینڈبل بھی نکالے۔ اگر واقعی وہ لوگ اپنی بات میں سنجیدہ ہیں تو کیوں نہیں پیامِ نو کی تحریروں پر فتویٰ لاتے؟ اس سال مئی۔ جون میں یہاں کے بہت سے ذاکرین اور علماء ایران تشریف لے گئے تھے۔ مرزا محمد اطہر صاحب تو اس وفد میں شریک تھے جو حکومتِ ایران

کی دعوت پر ہندوستان سے گیا تھا۔ ان لوگوں کی وہاں کے بڑے بڑے علماء سے ملاقات ہوئی۔ ہونا یہ چاہیے تھا کہ جن مسائل پر یہاں بڑی بڑی تقریریں کر چکے تھے اُن ہی موضوعات پر وہاں کے علماء سے بھی گفتگو کر لیتے اُن سے کہتے کہ جناب کچھ مسائل ایسے ہیں کہ جن میں لکھنؤ کے مومنین میں کافی انتشار ہے۔ لہٰذا آپ لوگ برائے مہربانی ان مسائل میں فتویٰ دے دیں تاکہ قومی انتشار ختم ہو جائے۔

ان لوگوں کا یہاں اشتعال انگیز تقاریر کرنا اور ان مسائل پر ایران وعراق کے حقیقی علماء سے رجوع نہ کرنا ہی ان کے خود اپنے ہی موقف کو غلط ماننے کا ثبوت ہے۔

عوام کی خوشنودی کے لیے لمبی چوڑی تقریر کرنا اور ہے اور عملی زندگی میں خود درست ہونا اور ہے۔ ایک صاحب نے حق خلافت غصب ہونے پر بڑی بڑی تقریریں کیں، خوب خوب نکتے اور گوشے پیدا کیے لیکن جب وہ مَر گئے تب معلوم ہوا کہ خود پوری زندگی غصبی مکان میں بسر کر گئے۔ اب آپ بتائیے کہ یہ اُن کے ایمان کا ثبوت ہے یا یہ کہ نفاق کا ثبوت ہے۔

حضرت علی علیہ السلام حضور اکرمؐ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا:

”ہر مسلمان دوسرے مسلمان کی نسبت تیس۳۰ حق رکھتا ہے جو اُسے انجام دینے چاہئیں اور یا یہ کہ وہ اسے بخش دے۔ مسلمان کو چاہیے کہ اپنے دینی بھائی کی لغزشوں سے چشم پوشی کرے اور پریشانی کے وقت اس پر رحم کرے۔ اس کے بھید چھپائے رکھے۔ اس کی غلطیاں

نہ پکڑے۔ اس کا عذر قبول کرے۔ بدگوئی کرنے والوں کے سامنے اس کا دفاع کرے۔ اسے نصیحت کرے۔ اس سے دوستی کو مستحکم کرے اور اس کے حقوق کی حفاظت کرے۔ بیماری کی حالت میں اس کی عیادت کرے اور اس کے مر جانے کی صورت میں اس کے جنازے کی تشییع کے لیے حاضر ہو۔ اس کی دعوت منظور کرلے اور اس کا ہدیہ قبول کرے۔ جو کچھ وہ عطا کرے اس کا بدلہ دے اور اس کی دی ہوئی نعمت کا شکریہ ادا کرے۔ اس کی بخوبی مدد کرے۔ اس کے ناموس کی حفاظت کرے اور اس کی ضرورتیں پوری کرے۔ اُسے اس کے مقصد تک پہنچائے۔ اسے چھینک آئے تو اس پر رحمت بھیجے اس کی گمشدہ چیزوں کی طرف اس کی رہنمائی کرے۔ اس کے سلام کا جواب دے۔ اس کی کہی ہوئی باتوں کو اچھا سمجھے۔ اس کے انعام کو اچھا سمجھے اور اس کی قسموں کی تصدیق کرے۔ اس کے دوستوں کا دوست ہو۔ خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم اس کی مدد کرے لیکن اگر وہ ظالم ہو تو اس کی مدد یہ ہے کہ اُسے ظلم سے باز رکھے اور اگر مظلوم ہو تو اس کی مدد یہ ہے کہ اس کے اپنا حق حاصل کرنے میں اس کی مدد کرے۔ حوادث کا مقابلہ کرنے کے لیے اُسے تنہا نہ چھوڑے اور جس چیز کو اپنے لیے اچھا سمجھے اسے اس کے لیے بھی اچھا سمجھے اور جو اپنے لیے نہ چاہے وہ اس کے لیے بھی نہ چاہے۔"

آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اللہ کی کتاب اور معصومین علیہم السلام

کے ارشادات کی روشنی میں موجودہ حالات پر غور کرکے راہِ راست کا انتخاب کریں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ سے ہماری یہی دعا ہے کہ وہ ہم سب کو نیک توفیق عطا فرمائے تاکہ حق کو پہچان کر اس پر عمل کیا جاسکے۔ آمین۔

محفل مودّت و رحمت

"محفل مودت و رحمت" نام ہے نکاح کی اس تقریب سعید کا جو ۱۳ر اکتوبر ۱۹۹۰ء کو سلطان المدارس میں منعقد ہوئی۔ جناب نجم الحسن عرف نجمی کا عقد مولانا کلب صادق صاحب کی بیٹی سے انجام پایا۔ اس پُر اثر تقریب میں بہت سی بے جا رسومات سے اجتناب کیا گیا۔ دولھا نے مہر کی رقم مبلغ پانچ ہزار چودہ روپئے پیشگی ادا کر دیے تھے اور مولانا موصوف نے بھی جہیز کے نام پر صرف قرآن کریم رحل اور جانماز دی۔

اس شادی کا اہم پہلو یہ ہے کہ کلب صادق صاحب کو اپنی بیٹی کے لیے مناسب رشتہ خود لکھنؤ ہی میں مل گیا۔ جو وسائل مولانا کلب صادق صاحب قبلہ کو حاصل ہیں اور یورپ و امریکہ میں جو اُن کے روابط ہیں ان کو دیکھتے ہوئے یہ بات یقینی تھی کہ بغیر جہیز کے ان کی لڑکی کی شادی ہو جائے گی، اگر یہاں رشتہ نہ ہوگا تو دوسرے ملک میں رشتہ ہو جائے گا۔ اصل بات ہے لکھنؤ کے ایک نوجوان کا بغیر جہیز کا مطالبہ کیے شادی کے لیے تیار ہونا اور مہر کی پوری رقم کا پیشگی ادا کر دینا۔ اس کے لیے جناب نجمی صاحب کو جتنی بھی مبارک باد دی جائے کم ہے۔

اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ آج بزرگ نسل کے مقابلہ میں نوجوان نسل میں

یہ مضمون پیامِ نو مورخہ ۱۹ر اکتوبر ۱۹۹۰ء کی اشاعت میں شائع ہو چکا ہے۔

زیادہ بیداری ہے۔ گزشتہ سال ہمارے ایک اور نوجوان ساتھی جناب عون نقوی صاحب کی شادی انتہائی سادگی کے ساتھ انجام پائی تھی اور جس میں بے جا رسومات سے یہاں تک اجتناب برتا کہ انھوں نے سہرا تک نہیں بندھوایا اور نہ ہی جہیز میں کوئی چیز لی۔

ہمارے نزدیک مولانا کلب صادق صاحب قبلہ کا قابل قدر کارنامہ اس تقریب سعید کا عنوان "محفل مودّت و رحمت" قرار دینا اور اپنی تقریر میں یہاں کے علمار کو اصلاح معاشرہ کے لیے ان کی ذمہ داریاں یاد دلانا ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر علمار اپنی ذمہ داریوں کو نیک نیتی سے نباہیں تو ابھی بھی کچھ گیا نہیں ہے۔ لیکن مسئلہ صرف کسی ایک رسم کا نہیں ہے۔ اصل مسئلہ ہے خوف خدا سے نڈر اور فکر آخرت سے بے پرواہ ہو جانا۔ اس کے لیے یہاں کے علمار کو پہلے خود اپنے گریبان میں منھ ڈال کر دیکھنا ہوگا کہ وہ کس منزل پر ہیں۔ کیا ان کو اللہ سے زیادہ عوام کا ڈر نہیں ہے؟ کیا وہ دنیا کی اس چند روزہ زندگی کو عافیت سے بسر کرنا آخرت کی عافیت سے بڑھ کر نہیں سمجھتے ہیں؟ کیا اللہ کی رضا کے بجائے عوام کی خوشنودی اور واہ واہ حاصل کرنا انھوں نے اپنا نصب العین نہیں بنا لیا ہے اور کیا درس و تدریس اور تعلیم و تعلّم کے بجائے سیاست اور پیسہ ان کا مشغلہ نہیں بن گیا ہے اور آج قوم میں مودت و رحمت کے بجائے بغض و عناد، نفاق و دُورُوئی کا چلن پھیل جانے میں ان حضرات کی غلط روش کو کیا کافی دخل نہیں ہے۔

اب جبکہ مولانا کلب صادق صاحب قبلہ ایک بڑے فرض سے سبکدوش

ہو گئے ہیں ہم ان سے گذارش کرتے ہیں کہ قوم میں مودت ورحمت کو فروغ دینے کے لیے وہ اس تنظیم کی تشکیل جلد از جلد کر دیں جس کا اعلان انھوں نے گذشتہ رمضان میں کیا تھا کیونکہ حالات حاضرہ اس بات کے متقاضی ہیں کہ منظم اور مسلسل جدوجہد کی جائے۔ ہم علی کانگریس کی جانب سے ہر تنظیم اور انجمن سے "تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰی" کے اصول پر تعاون کرنے کا اعلان کرتے ہیں اور ان سے اسی اصول پر تعاون کرنے کی درخواست بھی کرتے ہیں۔

ہماری اللہ سے دعا ہے کہ وہ محفل مودت ورحمت کے طفیل شیعانِ لکھنؤ کو مودت ورحمت سے ہمکنار کر دے۔ اللہ سے دعا ہے کہ وہ اپنی رحمتیں اور برکتیں جنابِ نجم الحسن نجمی اور ان کی اہلیہ پر نازل فرمائے تاکہ جس طرح یہ تقریب شادی مثالی بنی ہے اسی طرح ان کا گھر بھی مثالی بنے۔ آمین۔

طاغوت کا فیصلہ

قرآن کریم ہم سے اس بات کا مطالبہ کرتا ہے کہ ہم طاغوت کا انکار کریں اور یہ کہ ہم اپنے معاملات میں طاغوت سے فیصلہ نہ کرائیں۔ چنانچہ سورہ نساء کی ۶۰ ویں آیت میں ارشاد ہوا:

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ ۭ وَيُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ۝

"(اے نبی) کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو اس خام خیالی میں ہیں کہ وہ اُن (کتبِ آسمانی) پر جو تم پر اور تم سے پہلے نازل ہوئی ہیں، ایمان لے آئے ہیں لیکن وہ چاہتے ہیں کہ طاغوت (اور احکام باطل) سے فیصلہ کرائیں جبکہ انھیں حکم دیا گیا ہے کہ وہ طاغوت کا انکار کریں اور شیطان چاہتا ہے کہ انھیں بری طرح گمراہ کر دے (اور انھیں گمراہی کے دور دراز راستوں میں پھینک دے)"

اگر کوئی شخص اپنے آپ کو مومن اور خوش عقیدہ سمجھتا ہے مگر تنازعات

یہ مضمون پیامِ نو مورخہ ۹ / نومبر ۱۹۹۰ء کی اشاعت میں شائع ہو چکا ہے

میں اس بات کا خواہاں ہے کہ حکم الٰہی کے بجائے باطل نظام سے فیصلہ کرائے تو یہ اس کے دعوائے ایمانی کے جھوٹا ہونے کی دلیل ہے۔

لوگوں میں جھگڑے ہوا ہی کرتے ہیں۔ سوال اس بات کا اٹھتا ہے کہ ان جھگڑوں کا فیصلہ کرنے کا کیا طریقہ اختیار کیا جائے۔ ہم لوگ جس ملک میں رہتے ہیں وہاں اسلامی نظام نہیں رائج ہے۔ لیکن اس کے باوجود اگر مسلمان شریعت کے تقاضوں کی پابندی کرنا چاہیں تو بہت سے ایسے معاملات ہیں کہ جو شریعت کی حدود میں نمٹ سکتے ہیں۔

مثال کے طور پر اگر دو مسلمانوں میں زمین، جائداد یا کسی ایسے مسئلہ میں اختلاف پیدا ہو کہ جو فوجداری کا معاملہ نہیں ہے تو وہ باہم مل کر کسی تیسرے کو ثالث مقرر کر لیں اور جو وہ فیصلہ کرے اس کو مان لیں تو ایک طرف تو نظام باطل سے رجوع کرنے سے بچ جائیں گے اور دوسری جانب بہت سے غیر ضروری اخراجات اور نقصانات سے بھی بچیں گے۔

ایسے بہت سے واقعات پیش آتے ہیں کہ ایک صاحب نے مکان کرایہ پر لیا تو وعدہ کیا کہ جب مکان مالک کہے گا تو ایک ماہ کے اندر مکان خالی کر دیں گے۔ مگر جب مکان مالک نے خالی کرنے کو کہا تو فوراً جا کر عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا اور اسٹے آرڈر لے آئے اور یہ تدبیر اختیار کر کے وہ اپنے کو بہت ہوشیار سمجھتے ہیں۔

اسی طرح زمین، جائداد کے بٹوارے کے معاملات میں کہ جو فریق اپنے آپ کو فائدہ میں دیکھتا ہے وہ بجائے حق و انصاف کی راہ اپنانے کے دنیوی

فائدہ سے دست بردار ہونے کو تیار نہیں ہوتا۔

شادی بیاہ میں کبھی کبھی تلخیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ ناچاقی کی نوبت آجاتی ہے اور جھگڑا عدالت تک پہنچ جاتا ہے۔

اسی طرح کی بہت سی ایسی مثالیں ہیں کہ اگر افراد ملت شریعت کی پابندی کرنا چاہیں تو کسی مسلمان کو ثالث یا حکم بنا کر مسائل حل کر سکتے ہیں۔

ایک دفعہ مولانا کلب عابد صاحب قبلہ مرحوم نے نماز جمعہ کے خطبہ میں افغانستان کے شیعوں کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ افغانستان کی ایک تہائی آبادی شیعہ ہے۔ مگر شیعوں کا کوئی باہمی جھگڑا عدالت میں نہیں ہے۔ وہ لوگ آپس میں کسی کو حکم بنا کر فیصلہ کر لیتے ہیں۔

ہمارے یہاں بھی یہ چیز ممکن ہے۔ شرط یہ ہے کہ ہم ایک دوسرے پر اعتماد کرنا سیکھ لیں۔ باہمی اعتماد ایمان کا ثبوت ہے اور ایک دوسرے پر اعتماد نہ کرنا معاشرہ میں نفاق و دوروئی کی علامت ہے۔

جہاں تک ان مقدمات کا سوال ہے جو ایک مسلمان اور غیر مسلم کے درمیان ہیں تو ان مقدمات میں بھی مسلمان کی کوشش یہ ہونی چاہیے کہ وہ زیادتی کرنے والا نہ ہو اور اس کی کوشش اپنے حق کا دفاع کرنا یا اپنے حق کو طلب کرنا ہو مگر شرط یہ ہے کہ وہ اس "عدالت" سے انصاف کی امید نہ رکھے۔ باطل سے عدل کی امید رکھنا ہی کفر ہے۔

ہو سکتا ہے کہ کسی کے ذہن میں یہ سوال اُٹھے کہ جب عدل کی امید نہ ہو تو پھر مقدمہ ہی کیوں لے جایا جائے؟ اس کے لیے عرض کرنا ہے کہ اگر

حق غصب ہونے پر مکمل خاموشی اختیار کر لی جائے تو یہ ظلم کے آگے خود سپردگی اختیار کرنا ہوگا جو مناسب نہیں ہے۔ چنانچہ جناب فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کی سیرت اس بات پر گواہ ہے کہ آپ حاکمِ وقت کو حاکم جور ماننے کے باوجود اپنا حق طلب کرنے کے لیے دربار خلافت میں تشریف لے گئیں۔

افراد ملت سے ہماری یہی گزارش ہے کہ وہ آپسی معاملات میں فالتو مقدمہ بازی کے بجائے کسی ثالث کے ذریعہ مسائل کو حل کرنے کی کوشش کریں۔ اگر اس کوشش میں ان کو کچھ مالی نقصان بھی برداشت کرنا پڑے تو اس کو ہنسی خوشی برداشت کرلیں اور اس نقصان کو اللہ کی طرف سے آزمائش تصور کریں۔

طاغوت کی شناخت

آیات قرآنی کی روشنی میں ہماری ذمہ داری طاغوت کا انکار کرنے کی ہے اور جیسا کہ عرض کیا طاغوت سے مراد

۱۔ ہر وہ شخص ہے جو حدودِ الٰہی کو توڑنے والا ہو۔

۲۔ ہر وہ شے، شخص یا خواہش کہ جس کی اللہ کے سوا پرستش یا فرمانبرداری اختیار کی جائے اور حدود الٰہی سے تجاوز کیا جائے۔

۳۔ ہر وہ نظام باطل جو نظام الٰہی کے مقابل ہو۔

اب طاغوت سے انکار کرنے اس سے منھ موڑ کر اللہ کی طرف متوجہ ہونے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنے سماج کے طاغوت کو پہچانیں۔ یعنی پہلا سوال طاغوت کی شناخت کا ہے۔ اس کے لیے ہم کو اپنے یہاں کے رواج کا موازنہ نظام اسلام سے کرنا ہوگا۔

مثال کے طور پر اسلام کا تقاضہ ہے کہ جب ایک شخص لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللہِ کا اقرار کرتا ہے تو وہ "مسلمان" قرار پاتا ہے اب دیگر مسلمانوں پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ اس کے سلام کا جواب دیں، اس کی جان، مال و آبرو کی حفاظت کریں اور بغیر شرعی جواز کے اس کو

یہ مضمون پیام نو مورخہ ۱۶ر نومبر ۱۹۹۰ء کی اشاعت میں شائع ہو چکا ہے۔

کوئی ایذا نہ پہنچائیں۔ اب اس نظام اسلام کے مقابلہ میں کسی نے اپنی طرف سے یہ تبدیلی کرلی کہ جو شخص فلاں روایت کو مانے گا تب تو میں اس کے سلام کا جواب دوں گا ورنہ سلام کا جواب دینا کیسا میں اس کو اذیّت پہنچاؤں گا۔ اگر جسمانی اذیت نہ پہنچا سکوں گا تو کم سے کم طعن تشنیع ہی کرلوں گا ورنہ غیبت اور بہتان طرازی ہی سہی۔ اور پھر اس کے مسلمان ہونے کی حیثیت سے حقوق ادا کرنا تو دور رہا وہ تو میرے نزدیک کافر اور مشرک سے بھی بدتر ہو جائے۔ اللہ کا انکار کرنے والوں اور دوسروں کا اللہ کا شریک ٹھہرانے والوں سے تو میں دوستی رکھوں، اچھے تعلقات رکھوں، خوش اخلاقی کا مظاہرہ کروں، دوسروں سے "نمسکار" اور "جے رام جی کی" بھی کرلیا کروں مگر محض روایت یا کسی فروعی مسئلہ کے اختلاف کی بنیاد پر اس مسلمان سے قطع تعلق کرلوں، سلام دعا بند کردوں تو یہ کس بات کی علامت ہے؟ کیا یہ نظام اسلامی سے بغاوت نہیں ہے؟

ہم کبھی کسی مولوی یا مولانا کی ذات، کبھی کسی روایت یا نظریہ، کبھی کسی خاندان سے وابستگی کو اپنے تعلقات کا مرکز بنالیتے ہیں جو اس کو مانے گا وہ ہمارا دوست ہے اور جو اس کو نہیں مانے گا وہ ہمارا دشمن ہے۔ یہ روش طاغوت کی راہ ہے اور ہمیں اس سے خبردار اور ہوشیار رہنا چاہیے۔ جب ہم نے کلمہ طیّبہ کا اقرار کیا ہے تو اس کے معنی ہیں کہ ہم اپنے تعلقات، اپنی زندگی اور اپنے پورے وجود کے لیے اللہ کو مرکز و محور قرار دے رہے ہیں۔ اب جو اللہ کا مطیع و فرمانبردار ہے وہ ہمارا دوست ہے اور جو اللہ کا نافرمان ہے تو وہ ہم سے دور رہے۔

یہ بات ہمارے پیش نظر رہنی چاہیے کہ وہی چیز ایک وقت میں اللہ کی آیت، نشانی یا شعائرِ الٰہی میں سے ہو سکتی ہے اور وہی چیز اگر ہم حدِ اعتدال سے بڑھ جائیں تو طاغوت یا کفر و نفاق کی علامت بن سکتی ہے۔ دنیا میں جتنی چیزیں ہیں وہ اللہ کی مخلوق ہیں۔ یہ سورج، چاند، یہ موسموں کا پھیر بدل، یہ لمبی چوڑی زمین، اونچے اونچے پہاڑ، بہتے ہوئے دریا، خوبصورت پرندے، نفع پہنچانے والے جانور۔ اگر ہم اللہ کی ان مخلوقات کے ذریعہ سے اللہ کی معرفت حاصل کریں، ہمارے ایمان میں زیادتی ہو اور ہم اللہ کے زیادہ مطیع و فرماں بردار بنیں تو یہ تمام مخلوقات آیاتِ الٰہی قرار پائیں گی۔ لیکن اس کے برخلاف اگر سورج کی روشنی کو دیکھ کر ہماری آنکھیں چکاچوند ہو جائیں اور ہم بجائے سورج کے خالق کی معرفت حاصل کرنے کے سورج ہی کو خدا مان کر سجدہ کرنے لگیں۔ اگر عظیم پہاڑوں کی بلندی دیکھ کر بجائے ان پہاڑوں کے خالق کی عظمت کا تصور کرنے کے پہاڑوں اور پتھروں کو ہی سجدہ کرنے لگیں، کسی جانور سے پہنچنے والے نقصان کے خوف سے اس کی پرستش کرنے لگیں تو ہمارے یہ جذبات و محرکات ہم کو اللہ کی راہ میں آگے بڑھانے کے بجائے ہمارے اور معبودِ حقیقی کے درمیان آڑ بن جائیں گے اور ہمارے طاغی ہو جانے کا ذریعہ بنیں گے۔

اسی طرح اللہ کے نیک اور برگزیدہ بندوں کی مثال ہے۔ اگر حضرت عیسٰی علیہ السلام کی پاکیزہ زندگی سے متاثر ہو کر کوئی شخص راہ ایمان پر آئے اور خود بھی حضرت عیسٰی کا اتباع کرتے ہوئے قربتِ الٰہی کی منزلوں کو

طے کرے تو وہ مومن قرار پائے گا۔ لیکن اس کے برخلاف وہ جناب عیسٰی سے ہی اتنا متاثر ہو جائے کہ ان کو اللہ کا بندہ ہونے کے بجائے اس کا بیٹا قرار دے تو پھر وہ مومن نہ ہو کر مشرک ہو گا۔

اسی طرح رسول اکرمؐ اور ہمارے ائمۂ طاہرین علیہم السلام کی روشن زندگیاں ہیں کہ جن کی روشنی میں صراطِ مستقیم کو سر کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ان ذوات مقدسہ کی سیرت کا اتباع کرنے اور اطاعت الٰہی کی راہ میں آگے بڑھنے کا درس لینے کے بجائے ہم ان کے ذکر کو اطاعت الٰہی سے ٹکرانے لگیں، جب ہم ان کی زندگیوں سے متعلق روایات کو بنیاد بنا کر دوسرے مسلمانوں کو چڑھانے لگیں یا نفرت کا زہر گھولنے لگیں تو یہ روش ایمان کی راہ نہ ہو کر کفر و نفاق کے گڑھوں میں گرنا ہو گا۔

محبت اہل بیت کا دعویٰ بھی ہو اور اللہ کی نافرمانی بھی کی جائے تو یہ ایمان کی علامت نہ ہو کر کفر، شرک اور نفاق کی علامت ہو گا جس کی بہت سی مثالیں ہمارے معاشرہ میں موجود ہیں۔

طاغوت کا مقابلہ

جب ہم اپنے سماج میں طاغوت کی شناخت کریں گے تو ہم یہ پائیں گے کہ ہمارا سابقہ دو طرح کے طاغوتوں سے ہے۔

ایک قسم ان افراد کی ہے جو مسلمان ہونے کے دعوے دار ہیں لیکن اپنے عمل یا اپنی بے عملی سے اسلام کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔ اور دوسری قسم ان افراد کی ہے جو دائرہ اسلام کے باہر ہیں اور اسلام دشمنی میں لگے ہیں۔ یعنی ایک داخلی محاذ ہے اور دوسرا خارجی محاذ ہے۔

اس وقت جو ملک کا ماحول ہے اس میں خارجی محاذ پوری جارحیت کے ساتھ سرگرم عمل ہے۔ فسادات کا ایک سلسلہ ہے جو نہتے اور بے گناہ افراد کو مظالم کا نشانہ بنا رہا ہے۔ مسلمانوں کی جان، مال، عزت و آبرو محفوظ نہیں ہے۔ لیکن اگر ہم غور کریں تو معلوم ہوگا کہ ہماری داخلی محاذ کی کمزوری کے سبب آج ہم پر خارجی حملے ہو رہے ہیں۔

اگر مسلمانانِ ہند کے پیش نظر یہ رہا ہوتا کہ ہمیں اسلام کے پیغام کو پھیلانا ہے اور اگر ہم اشاعت اسلام میں کوتاہی کریں گے تو تاریخ ہم کو نہیں بخشے گی تو شائد ہندوستان کا نقشہ کچھ اور ہوتا۔ مسلمانوں کا تخلف

یہ مضمون پیام نو مورخہ ۲۳ر نومبر ۱۹۹۰ کی اشاعت میں شائع ہو چکا ہے۔

فرقوں اور گروہوں میں بٹ جانا اور ہر فرقہ کے مسلمان کا دوسرے فرقہ کے مسلمان کو کافر سے بدتر قرار دینا اور پھر ہر فرقہ کے مسلمانوں میں داخلی گروپ بازیاں اور تکفیر کے فتوے، یہ سب وہ مسائل ہیں کہ جنھوں نے مسلمانوں کو اپنی عظیم ذمہ داریوں سے غافل کر دیا ہے۔

مسلمانوں کے ہر فرقہ میں ایسے بدبخت افراد پیدا ہو گئے جنھوں نے وحدت اسلامی کو پارہ پارہ کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ جنھوں نے دین کے مفہوم کو یکسر بدل دیا۔ اور یہ ساری حرکتیں مذہب کے نام پر مذہب کے پلیٹ فارم سے کی گئیں جس کا خمیازہ آج پوری اُمّتِ مسلمہ کو بھگتنا پڑ رہا ہے۔

جو لوگ ہندوستان کی تاریخ سے ذرا بھی واقفیت رکھتے ہیں وہ یہ جانتے ہیں کہ یہاں ہمیشہ سے ذات پات کی لڑائی رہی۔ اونچی ذات کے ہندو نیچی ذات کے ہندوؤں پر مظالم ڈھاتے رہے۔ اگر مسلمانوں نے اپنی شرعی ذمہ داری نباہتے ہوئے ان مظلوم اور محروم نیچی ذات کے ہندوؤں کے حالات میں بہتری لانے کی کوئی سنجیدہ کوشش کی ہوتی تو کتنے ہی نیچی ذات کے ہندو حلقہ بگوش اسلام ہو چکے تھے۔ مگر افسوسناک بات یہ ہوئی کہ اس ذمہ داری کو انجام دینے کے بجائے ایک فرقہ کے مسلمان خود دوسرے فرقہ کے مسلمان کے خلاف اس طرح صف آرا ہوئے کہ جب ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر ہندو مذہب کو چھوڑ کر دوسرا مذہب اختیار کرنے کے لیے آگے بڑھے تو ان کو کہنا پڑا کہ اسلام ایک اچھا مذہب ہے لیکن میں اسلام قبول نہیں کر سکتا۔ کیونکہ اگر میں اسلام مذہب قبول کروں تو مجھے کسی ایک مسلک سے وابستہ

ہونا پڑے گا اور جب میں اسلام کے کسی ایک مسلک سے وابستہ ہوں گا تو خود مسلمانوں کے دوسرے مسلک کے لوگ مجھے کافر سے بدتر قرار دیں گے۔ چنانچہ ڈاکٹر امبیڈکر اور ان کے ساتھ ہزاروں افراد نے ہندو مذہب چھوڑ کر بودھ مذہب اختیار کر لیا۔ اور ایسا کرنے میں وہ لوگ حق بجانب بھی تھے۔ کیونکہ اگر کوئی ہندو تبدیلی مذہب کر کے مسلمان ہوا بھی تو ہم نے اس کے ساتھ وسعتِ قلبی کا کوئی مظاہرہ نہیں کیا بلکہ اس کو شک یا حقارت کی نگاہ سے دیکھا۔ اس سے کسی قسم کا معاشرتی تعلق رکھنا ہم نے کسرِ شان سمجھا۔ یعنی جب تک وہ اسلام کے دائرہ کے باہر تھا ہمیں کوئی تکلیف نہیں تھی۔ ہو سکتا ہے کہ ہم اس سے خوش دلی کا مظاہرہ کرتے رہے ہوں لیکن ادھر وہ دائرہ اسلام میں آیا اور ہم نے اس کو اپنے سے ذلیل اور پست سمجھنا شروع کر دیا۔ حالانکہ اگر ہم شریعت کی پابندی کر رہے ہوتے تو ہم اس کے ساتھ زیادہ عزت اور احترام کا مظاہرہ کرتے اور اس کی تالیف قلب کے لیے مالی اعانت بھی کرتے اور معاشرتی تعلقات بھی قائم کرتے۔

اس لیے جب ہم طاغوت سے مقابلہ کی بات کریں گے تو پہلے ہم کو اپنی ذہنیت کو بدلنا ہو گا۔ ہم کو اپنے اپنے فرقوں میں یہ دیکھنا ہو گا کہ وہ کون لوگ ہیں جنھوں نے اللہ اور رسول کے بتائے ہوئے اصولوں سے روگردانی اختیار کر کے دوستی اور دشمنی کے نئے اصول گڑھ لیے ہیں۔ ہم کو ان بدبختوں کی شناخت کرنی ہو گی جو اپنے وجود سے اسلام کی صفوں میں رخنہ اندازی کر رہے ہیں اور ہم کو اپنے لیے، اپنے مذہب کے لیے ان طاغوتوں اور سرکشوں سے مقابلہ کرنا ہو گا۔ بغیر داخلی محاذ پر کامیابی حاصل کیے ہوئے اسلام کے خارجی دشمنوں سے ہم مقابلہ نہیں کر پائیں گے اور کمزور سے کمزور تر ہوتے جائیں گے۔

طاغوت سے مقابلہ کے چند اصول

گذشتہ مضمون میں ہم نے عرض کیا کہ ایک داخلی محاذ ہے اور دوسرا خارجی محاذ ہے اور جب تک ہم داخلی محاذ پر کامیابی حاصل نہیں کرلیں گے اس وقت تک ہم اسلام کے خارجی دشمنوں سے مقابلہ نہیں کرپائیں گے اور کمزور سے کمزور تر ہوتے جائیں گے۔ اس ضمن میں مندرجہ ذیل نکات پیش خدمت ہیں:

۱۔ دائرہ اسلام میں آنے کے لیے بنیادی عقائد تین ہیں۔ توحید، ہدایت اور قیامت۔ جو شخص ان بنیادی عقائد کو اصولی طور پر مانتا ہے وہ مسلمان ہے۔

۲۔ اسلام کے مختلف مسالک میں جو اختلافات ہیں وہ محض فروعی ہیں اور ان فروعی مسائل میں فقہی اختلافات کو اس انداز سے دیکھنا کہ گویا یہ حق و باطل کا فرق ہے محض نادانی ہے۔

۳۔ جس طرح سے کسی باغ میں مختلف قسم کے رنگ برنگ کے پھول کھلے ہوتے ہیں جس سے اس باغ کی خوش نمائی میں اضافہ ہی ہوتا ہے اسی طرح گلشن اسلام میں مسالک کا اختلاف اسلام کے عظیم مفاد میں ضروری ہے بشرطیکہ ہم اختلاف کے اسلامی آداب و اصول کی پابندی کریں۔

۴۔ قرآن کریم میں سورۂ بقرہ کی ۱۴۸ ویں آیت میں یہ سنہرا اصول پیش کردیا

یہ مضمون پیام نو مورخہ ۳۰ر نومبر ۱۹۹۰ء کی اشاعت میں شائع ہوچکا ہے۔

گیا ہے کہ

وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ ط

"اور ہر ایک کے لیے ایک سمت مقرر ہے جس کی طرف وہ اپنا رُخ کرتا ہے۔ پس تم نیکیوں میں لپک کر آگے بڑھ جاؤ۔"

یعنی ہم اپنی صلاحیتوں کو فالتو بحثوں میں ضائع کرنے کے بجائے میدانِ عمل میں نیکیاں انجام دیں۔ مسالک کے وہ اختلافات جن کا حل نہ اس وقت ممکن ہے اور نہ ہی اس کا تعلق آج کی دنیا کے مسائل سے ہے اسے صرف علماء کے طبقہ تک محدود رہنے دیں۔

۵۔ سورۂ بقرہ کی ۶۲ ویں آیت میں (اور اسی مضمون کی تکرار سورہ مائدہ کی ۶۹ ویں میں ہوئی ہے) ارشاد رب العزت ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰى وَالصّٰبِـِٕيْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝

"بے شک وہ لوگ کہ جو ایمان لائے اور جو لوگ کہ یہودی عیسائی اور صابی ہیں (ان میں سے) جو بھی اللہ پر اور روز آخرت پر ایمان لائے اور نیک اعمال انجام دے تو اس کا اجر اس کے پروردگار کے پاس ہے اور نہ ان پر کوئی خوف طاری ہو گا اور نہ ہی وہ غمگین ہوں گے۔"

یعنی اگر کوئی شخص مسلمان نہ بھی جانا جاتا ہو مگر تین شرطیں اس میں پائی

جاتی ہوں۔ اللہ پر ایمان، آخرت پر ایمان اور نیک اعمال کا انجام دینا۔ تو اس کے لیے آخرت میں اجر ہے۔ بعض احادیث میں وارد ہوا ہے کہ قیامت میں بہت سے افراد ایسے ہوں گے کہ جو مسلمانوں کے قبرستان سے اٹھائے جائیں گے اور جہنم میں داخل کیے جائیں گے اور بہت سے افراد ایسے ہوں گے کہ جو غیر مسلمین کے قبرستان سے اٹھائے جائیں گے اور جنت میں داخل کیے جائیں گے۔

۶۔ پروردگار عالم نے تمام قوموں میں ہادی بھیجے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ان ہادیانِ برحق کو بعد میں ان کی قوم والوں نے خدا یا خدا کا بیٹا مان لیا ہو۔ جن علماء نے مذہبی کتابوں کا تقابلی مطالعہ کیا ہے، ان کے نزدیک اہل ہنود کی مذہبی کتابوں (وید اور گیتا) میں بہت سی ایسی تعلیمات ہیں کہ جو بعض آیاتِ قرآنی سے مطابقت رکھتی ہیں اور ان تعلیمات کے الٰہی اور الہامی ہونے کو ثابت کرتی ہیں۔

خود قرآن کریم کا اندازِ بیان بھی یہ ہے کہ وہ گزشتہ کتابوں کی تکذیب نہیں کرتا ہے بلکہ ان کی تصدیق کرتا ہے۔ لہٰذا ہم کو دیگر مذاہب کے افراد کے ساتھ زیادہ وسعت قلبی کے ساتھ اور اس انداز سے ملنا چاہیے کہ ہم ان کی بات سن سکیں اور اپنی بات کہہ سکیں اور جب غیر مسلمین کے ساتھ یہ روش ہو گی تو پھر برادران اسلام کے ساتھ تو بدرجہ اولیٰ ہم کو نرم روی سے ملنا پڑے گا۔

۷۔ مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے مابین مخالفت کی ایک وجہ دورِ اوّل

کی شخصیات اور ان کے کارنامے ہیں۔ جن شخصیتوں سے ہم عقیدت رکھتے ہیں ان کے کارناموں کو ہم اپنے لیے مقامِ فخر میں پیش کرتے ہیں۔ اور ان کا مقابلہ ان شخصیتوں سے کرتے ہیں کہ جن کو دوسرے فرقے کے مسلمان عقیدت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر شیعہ حضرات کا حضرت علی علیہ السّلام کی سیرت کا تقابل سیرتِ شیخین سے کرنا یا حضراتِ اہلِ سنت کا خلفائے ثلاثہ کے دور کی ملکی فتوحات کا تذکرہ کرنا۔ حالانکہ یہ سب بچکانہ حرکتیں ہیں۔ قرآنِ کریم میں اس سلسلہ میں واضح اصول پیش کر دیا گیا ہے جس کی تکرار سورہ بقرہ کی ۱۳۴ اویں و ۱۴۱ ویں آیات میں ہے۔ ارشاد رب العزت ہے:

تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ج لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُم مَّا كَسَبْتُمْ ج وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝

"یہ وہ لوگ تھے جو گزر گئے۔ ان کے لیے وہ ہے جو انھوں نے کمایا اور تمھارے لیے وہ ہے جو تم کماؤ گے، اور ان کے اعمال کے بارے میں تم سے نہیں پوچھا جائے گا۔"

اس آیۂ کریمہ میں لَا تُسْأَلُونَ آیا ہے اور لَا تَسْأَلُوا نہیں آیا ہے۔ لَا تُسْأَلُونَ کے معنی ہیں "تم سے نہیں پوچھا جائے گا" اور اگر لَا تَسْأَلُوا ہوتا تو اس کے معنی ہوتے "تم نہ پوچھو"۔ اس طرح گذشتہ واقعات اور حالات کے بارے میں معلومات حاصل کرنا نہیں منع کیا گیا ہے بلکہ قرآن کریم خود کتنے ہی گذشتہ واقعات کو بیان کرتا ہے۔ مگر ان گذشتہ واقعات کے بیان کا یہ مقصد نہیں ہے کہ ہم سے روزِ قیامت ان بیان کردہ واقعات میں سے کوئی سوال

کیا جائے گا۔ بلکہ ان کا مقصد یہ ہے کہ ہم ان واقعات سے اپنی زندگی کے لیے عملی درس حاصل کریں۔ نیکو کاروں کے تذکرے سے ہم میں نیکی کا جذبہ بیدار ہو۔ صابروں اور مجاہدوں کے کارناموں سے ہم شجاعت، صبر اور استقامت کا سبق حاصل کریں۔ اللہ کے پسندیدہ بندوں کی صفات سے ہم بھی اپنے نفس کے تزکیہ کی طرف متوجہ ہوں۔ اس طرح ظالموں اور بدکاروں کے تذکروں سے ہم درس عبرت حاصل کریں اور ہر طرح کی گمراہی سے بچنے کی تدبیر کریں۔

اب اگر مسلمانوں کے مختلف فرقے یا کسی ایک فرقہ کے اندر ہی مختلف گروپ ماضی کے واقعات یا شخصیات کو بنیاد بنا کر آپس میں دست بگریباں ہو جائیں تو کیا یہ کوئی پسندیدہ عمل قرار پائے گا؟

۸۔ قرآن کریم کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ شروع سے لکھا جاتا رہا اور ہر قسم کی تحریف سے پاک ہے لیکن جہاں تک احادیث اور صدر اول کے تاریخی واقعات کا سوال ہے تو ان کی کتابت سیکڑوں برس کے بعد ہوئی۔ لہٰذا ان میں تحریف کی گنجائش اور جزئیات میں اختلاف کے مواقع پیدا ہو گئے۔

آج اگر ہم چودہ سو برس کے بعد ان اختلافات کو بنیاد بنا کر قرآن اور معتبر احادیث میں افتراق سے بچنے کے واضح احکام کے باوجود محض نظریاتی اختلاف کی بنیاد پر نفرت کی دیواریں کھڑی کریں تو یہ شیطانی عمل ہو گا۔

طاغوت کے ساتھی

سورہ بقرہ کی ۲۵۷ ویں آیت میں ارشاد ہوا :

اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۬ۗ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰٓـُٔهُمُ الطَّاغُوْتُ ۙ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝

"اللہ مومنین کا سرپرست ہے اور ان کو تاریکیوں سے نکال کر نور کی طرف لے جاتا ہے اور جن لوگوں نے کفر اختیار کیا ان کے ساتھی طاغوت ہیں جو ان کو نور سے بہکا کر تاریکیوں میں لے جاتے ہیں۔ یہی لوگ جہنمی ہیں اور وہ اس جہنم میں ہمیشہ رہیں گے۔

ہم یہاں پر آپ کی توجہ اس آیہ کریمہ کے دوسرے جز کی طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں جس میں ارشاد ہوا يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ یعنی طاغوت اپنے ساتھیوں کو نور سے بہکا کر تاریکیوں میں لے جاتے ہیں۔ یہ آیہ کریمہ اس بات سے خبردار کرتی ہے کہ اگر کوئی شخص نور میں ہے، راہ حق پر ہے تب بھی اس کو اس بات سے ہوشیار رہنا چاہیے

یہ مضمون پیام نو مورخہ ۱۷ دسمبر ۱۹۹۰ء کی اشاعت میں شائع ہو چکا ہے۔

کہ کہیں کوئی طاغوت اسے بہکا کر تاریکیوں کا شکار نہ بنا دے اور وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جہنم کے عذاب میں مبتلا ہو جائے۔

طاغوت لوگوں کو گمراہ کرنے کے لیے کبھی خود حق کا ہی استعمال کرتا ہے۔ اس کی مثال دیکھنا ہو تو پچھلے پچاس سال کی شیعوں کی تاریخ دیکھ ڈالیے۔ قضیہ شہید انسانیت سے لے کر تحریک دین فہمی کی مخالفت تک، کس طرح سے غیر ذمہ دار ذاکرین نے منبر کو استعمال کیا اور افرادِ ملت کو اشتعال دلا کر گمراہ کیا اور اپنی بدکرداریوں کو چھپانے کے لیے "محبّت اہل بیت" کی دہائی دیتے رہے۔ محبت اہل بیت جذبۂ حق ہے اور ایمان کی علامت ہے لیکن یہی حق جب طاغوتی طاقتیں لوگوں کو غلط سمت میں بہکانے کے لیے استعمال کرتی ہیں تو بہتوں کو گمراہ کر دیتی ہیں۔ ایسے موقع پر لوگ جذبات میں اندھے ہو کر حدودِ الٰہی سے تجاوز کرتے ہیں اور اپنی سرکشی کو ایمان کا تقاضہ سمجھنے لگتے ہیں۔ یاد رکھیے کہ اللہ کی محبت سے رسول کی محبّت ہے اور رسول کی محبت سے آلِ رسول کی محبت ہے۔ محبت کا بنیادی مرکز و محور ذاتِ الٰہی ہے۔ محبت الٰہی کا تقاضہ ہے کہ اللہ کی اطاعت اور اس کے رسول کا اتباع کیا جائے۔ اب اگر ہم رسول کی محبت یا آلِ رسول کی محبت میں طاغوت کا اس طرح کہنا ماننے لگیں کہ ہم نام تو رسول یا آلِ رسول کا لے رہے ہوں مگر عمل ہمارا حکم الٰہی کے خلاف ہو تو اس کے معنیٰ یہ ہوئے کہ اس منزل پر ہماری محبت کا مرکز اللہ کی ذات نہ ہو کر وہ ذات قرار پائے گی کہ جس کی محبت میں ہم حدودِ الٰہی سے تجاوز کر رہے ہیں۔ اور ایسی صورت میں قرآنِ کریم کے سورہ بقرہ کی

۱۶۵ویں آیت ہمارے ایمان کی نفی اور سخت عذاب کی خبر دے گی۔ آیت کے الفاظ ہیں:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ وَلَوْ يَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ ۙ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعَذَابِ ○

"اور لوگوں میں کچھ ایسے بھی ہیں جنھوں نے اللہ کے ہمسر بنا لیے ہیں اور جیسی محبت اللہ سے رکھنی چاہیے ویسی ان سے رکھتے ہیں اور جو سچے مومن ہیں وہ سب سے بڑھ کر اللہ سے محبت رکھتے ہیں۔ اور کاش ان ظالموں کو وہ بات سجھائی پڑتی جو عذاب دیکھنے کے بعد سمجھ میں آئے گی کہ ہر طرح کی قوت اللہ کے لیے خاص ہے اور بے شک اللہ سخت عذاب دینے والا ہے۔"

اس طرح کے بد بخت ذاکرین نے محبت اہلِ بیتؑ کے نام پر اس انداز سے لوگوں کو راہِ حق سے منحرف کیا کہ گناہانِ کبیرہ کو کارِ خیر کی حیثیت سے پیش کر دیا۔ بدی، غیبت، طعن تشنیع، جھگڑا فساد، واجباتِ الٰہی کا مضحکہ اڑانا، افتراق بین المومنین اور اختلاف بین المسلمین، یہ سب ناپسندیدہ اعمال کے بجائے نیکی قرار پا گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اتحاد و اخوت کے بجائے جوتیوں میں دال بٹنے لگی بھائیوں کے درمیان دیواریں کھڑی ہو گئیں۔ قوم آگے بڑھنے کے بجائے پستی میں گرتی چلی گئی۔ روایتوں کے اختلاف میں افرادِ ملت اس طرح پھنسے کہ نہ تو

اس کا ہوش رہا کہ زمانہ کی کیا رفتار ہے، اوقاف کس طرح تباہ ہو رہے ہیں۔ دوسروں سے ہم کتنا پچھڑ گئے ہیں۔ شیعوں کی عزت کس طرح نیلام ہو رہی ہے اور نہ ہی یہ احساس رہا کہ صفِ عزا کا ماحول اتنا غیر سنجیدہ ہو گیا کہ دوسرے مسلک اور مذہب کے افراد نے ان بدتمیزیوں سے بددل ہو کر ہمارے یہاں شریک ہونا چھوڑ دیا۔

لیکن بات صرف یہیں تک رہتی تو غنیمت تھا مگر ایک المیہ اور ہوا اور وہ تھا ان طاغوتوں کے ساتھیوں کا۔ یہ دوسرا پہلو اُن علماء و ذاکرین سے متعلق ہے کہ جنھوں نے اپنی بے عملی اور خاموشی سے ناقابل تلافی نقصان پہنچایا۔ اگر ہم اس کی مثال دینا چاہیں تو واقعۂ کربلا میں امام حسین علیہ السلام کے دو طرح کے مخالف ملتے ہیں۔ ایک مخالف وہ تھے جو عملی طور پر میدانِ جنگ میں مقابل تھے اور دوسرے وہ افراد تھے کہ جو امام حسین علیہ السلام کی مدد کو آسکتے تھے مگر نہیں آئے اور اپنے لیے گوشۂ عافیت پسند کر لیا۔ اب چاہے وہ مکہ، مدینہ یا کوفہ میں یتیموں، بیواؤں کی مزاج پرسی کرنے میں لگے رہے ہوں یا کہیں روایتیں یا حدیثیں بیان کرنے میں لگ گئے ہوں، وہ حق سے منحرف اور میدانِ عمل سے بھاگے ہوئے شمار ہوں گے۔ یہی نوعیت ان علماء، ذاکرین اور دانشوروں کی بھی ہے کہ جو قوم کی تباہی کے خاموش تماشائی بنے رہے اور سورہ مائدہ کی ۶۲ ویں و ۶۳ ویں آیات کی طرف کوئی توجہ نہیں کی جس میں ارشاد ہوا:

وَتَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يُسَارِعُوْنَ فِى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ

وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ ؕ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ لَوْلَا يَنْهٰهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ ؕ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ۝

"تم ان میں سے بہت لوگوں کو دیکھو گے کہ گناہ، سرکشی اور حرام مال کھانے کی طرف دوڑ پڑتے ہیں۔ جو کام یہ لوگ کرتے تھے وہ یقیناً بہت برا ہے۔ ان کو علماء اور راہبوں نے انھیں ان کی مبنی بر گناہ تقاریر اور حرام خوری سے کیوں نہیں روکا؟ جو (چشم پوشی کی) روش ان علماء و راہبوں نے اختیار کی وہ یقیناً بہت بُری ہے۔"

گذشتہ چند برسوں میں یہاں کے بعض بے عمل ذاکرین اور ان کے حواریوں نے بجائے کسی منطقی گفتگو کرنے کے پیامِ نو اور دین فہمی کی اندھی مخالفت کی۔ مگر اللہ کا شکر ہے کہ ان بدبختوں کا طلسم ٹوٹ گیا۔ آج جس انداز سے پیامِ نو مسجد آصفی میں تقسیم ہوتا ہے کہ مومنین کرام خود ایک ایک پرچہ اٹھا لیتے ہیں وہ خود جھوٹوں کے منھ پر ایک طمانچہ ہے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ ہر شخص ہمارا ہم خیال ہو جائے بلکہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ افرادِ ملت ہم سے اتفاق کریں یا اختلاف کریں ان کو پورا اختیار ہے مگر قرآن کریم میں صاحبانِ عقل کی ایک نشانی جو بیان کی گئی ہے کہ "وہ ہر بات کو توجہ کے ساتھ سنتے ہیں اور جو بہتر ہوتا ہے اس کے مطابق عمل کرتے ہیں" اس کو پیش نظر رکھیں سب کی باتیں سُنیں اور خود اپنی عقل کے ترازو پر حق و باطل کو تول لیں۔

اگر آپ ذرا سا بھی ذہن پر زور دیں تو آپ آسانی کے ساتھ اپنے معاشرہ میں طاغوتوں اور ان کے ساتھیوں کو پہچان سکتے ہیں۔

فسادات سے سبق

اس دنیا میں کہیں زلزلے کہیں آتش فشاں پہاڑ کہیں سیلاب اور طوفان انسانی ہلاکتوں کا ذریعہ بنتے ہیں اور کہیں خود آدمی آدمی کی ہلاکت کا سبب بنتا ہے۔ کبھی جنگ کی صورت میں، کبھی نظریاتی، مذہبی، جغرافیائی، لسانی یا قومی اختلاف کی بنیادوں پہ آدمی کا خون بہانا جائز، مباح اور عملِ خیر قرار پاتا ہے۔

آج کل ہمارا ملک ہندوستان ایک بدترین جنون کی لپیٹ میں ہے۔ معصوم بچوں، کمزور عورتوں اور بیمار بوڑھوں تک کو نہیں بخشا جا رہا ہے۔ پولیس، پی۔ اے۔ سی۔ اور انتظامیہ جن کی ذمہ داری قانون کو نافذ کرنا اور شہریوں کی جان، مال اور آبرو کی حفاظت کرنا ہوتا ہے وہ بھی بسا اوقات اس پاگل پن کا شکار ہو کر خود قانون شکنی کے مُرتکب ہو جاتے ہیں۔ جس انداز سے فسادات کی آگ بھڑکائی جا رہی ہے اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ بابری مسجد کا صرف ایک بہانہ ہے اور اصل نشانہ اسلام ہے۔ وہ لوگ جو ہندو مذہب کی کمزوریوں سے بخوبی واقف ہیں اور حالیہ برسوں میں بڑے پیمانے پر ہندوؤں کا اپنے مذہب کو چھوڑ کر دوسرے مذہب قبول کرنے سے پریشان ہیں انھوں نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ ایک طرف ہندو مسلم منافرت پھیلا کر خود اپنے مذہب

یہ مضمون پیام نو مورخہ ۲۱ر دسمبر ۱۹۹۰ء کی اشاعت میں شائع ہو چکا ہے

والوں کو مسلمانوں سے دور اسلام سے متعصب کر دیں اور دوسری طرف مسلم دشمنی کی بنیادوں پر تمام ہندوؤں کو متحد کر دیں۔

جس طرح دنیا کے کسی بھی خطے میں رہنے والا اور کسی بھی مسلک کا مسلمان ہو اس کے پاس توحید، قرآن اور رسالتِ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بنیادوں پر اتحاد و اخوت کا رشتہ موجود ہے مگر ہندو حضرات کے پاس ایسی کوئی قدر مشترک نہیں ہے۔ بلکہ اس کے برخلاف اس مذہب کی بڑی تعداد کو چھوا چھوت کی بنیادوں پر جانوروں سے بدتر سمجھا جاتا رہا ہے اور جن مظالم کا نشانہ اس وقت مسلمانوں کو بنایا جا رہا ہے اس سے کہیں زیادہ مصائب ہریجنوں پر ڈھائے جاتے رہے ہیں اور آج بھی ڈھائے جا رہے ہیں۔

ہندو وشو پریشد اور دیگر فرقہ پرست ہندو تنظیمیں اپنی بنیادی پالیسی میں ناکام ہو گئی ہیں۔ یہ لوگ یہ سمجھ رہے تھے کہ ۳۰ر اکتوبر اور ۶ر دسمبر ۱۹۹۰ء کا ہوا کھڑا کر کے مسلمانوں کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیں گے۔ مگر بحمد اللہ ان لوگوں کو ناکامی کا منھ دیکھنا پڑا۔ مسلمانوں نے کسی بھی قسم کے خوف وہراس کا مظاہرہ نہیں کیا۔ یہ ٹھیک ہے کہ فسادات میں ہر طرح کا نقصان ہم کو ہی برداشت کرنا پڑتا ہے مگر اس کے یہ معنیٰ نہیں ہیں کہ ہم طاغوتی طاقتوں کے ہاتھ بیعت کر کے اپنے ایمان باللہ سے دستبردار ہو جائیں۔

بہرحال اس فرقہ پرستی کا مقابلہ کرنے کے لیے ہم کو مندرجہ ذیل نکات کو پیش نظر رکھنا ہو گا

۱۔ ہم کو اپنی اس ذمہ داری کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا ہو گا کہ ہمیں اسلام کے

پیغام کو دیگر قوموں تک پہنچانا ہے

۲۔ اس کے لیے ہم کو عقل و منطق کی روشنی میں گفتگو کرنا ہوگی اور معجزات و کرامات کے سہاروں سے کام نہیں چلے گا۔

۳۔ ہم کو دیگر اقوام کے سامنے "اُمتِ مسلمہ" کو ذی علم، سنجیدہ اور باشعور افراد کی ایک متحد و منظم جماعت کی حیثیت سے پیش کرنا ہوگا۔

۴۔ اسلام دشمن طاقتوں کا مقابلہ کرنے کے لیے ہم کو ہر محاذ پر تیاری کرنی ہوگی خاص طور پر اخبارات و رسائل کے ذریعہ اپنی بات کہنا ہوگی۔ ابھی فی الوقت ہمارے پاس کوئی مناسب اخبار نہیں ہے۔ موجودہ پُر آشوب حالات کی ایک بڑی وجہ ہمارے پاس کوئی ہندی روزنامہ نہ ہونا اور نیشنل پریس کا مسلمانوں کے خلاف جارحانہ روش اپنانا ہے۔

۵۔ ہم کو اس بات کی کوشش کرنا چاہیے کہ ہم میں سے ہر شخص کا نام ووٹرز لسٹ میں درج ہو جائے۔

۶۔ ہمارے نوجوانوں کو خاص طور پر حفاظت خود اختیاری کی تدابیر میں مہارت حاصل کرنا ہوگی۔

۷۔ ہمیں مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے مابین اتحاد کو بڑھاوا دینے اور غیر اقوام کے کمزور طبقوں کی مدد کرنے کے لیے باقاعدہ تحریکی طور پر مسلسل کام کرنا ہوگا۔

۸۔ ہمیں طاغوتوں سے خوفزدہ ہونے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ ہر طرح کی قوت و طاقت اللہ ہی کو حاصل ہے، وہی ہمارا نگراں اور سرپرست ہے۔ اگر ہم اپنی دینی اور قومی ذمہ داریوں کو نیک نیتی سے نباہیں گے تو انشاء اللہ اس کی مدد شامل حال ہوگی اور حالات کی اصلاح ہوگی۔

روشن مستقبل

ملک کے مختلف حصوں میں ہونے والے حالیہ فسادات اور فسطائی طاقتوں کے مظالم کی لرزہ خیز داستانوں کو سننے کے بعد شاید کوئی شخص یہ سوچنے لگے کہ اب ہندوستان میں مسلمانوں کا مستقبل بہت تاریک ہے۔ ہندو فرقہ پرستی کا جنون ہندوستان میں اسلام کی شمع کو گل کردے گا۔ لیکن جو شخص تاریخ عالم پر نگاہ رکھتا ہے وہ جانتا ہے کہ جس آزمائش سے مسلمانانِ ہند گزر رہے ہیں اگر اس میں وہ ثابت قدم رہے اور ماضی کی اپنی غلطیوں کی اصلاح کر لی تو انشاء اللہ نہ صرف یہ کہ وہ خود سرخرو اور کامیاب رہیں گے بلکہ یہاں کی ایک بڑی آبادی کو بھی دائرہ اسلام میں لانے کا ذریعہ بنیں گے۔

موجودہ بابری مسجد تنازعہ سے ایک بہت بڑا فائدہ یہ ہوا ہے کہ ہندو حضرات کی ایک بڑی تعداد اپنے مذہب کی طرف راغب ہوئی۔ ابھی تک یہ لوگ پیدائشی طور پر تو ہندو تھے مگر کسی بھی قسم کے مذہبی رجحان سے یکسر عاری تھے۔ اس مذہبی رجحان کے پیدا ہونے کے بعد انشاء اللہ ان ہی میں سے ایسے افراد کی ایک جماعت نکلے گی جو وجود الٰہی و دیگر بنیادی مسائل پر غور و خوض کریں گے، جن میں تلاش حق کا جذبہ بیدار ہوگا اور وہ انشاء اللہ اپنے مذہب کی خامیوں کا

یہ مضمون پیامِ نو مورخہ ۲۸ ردسمبر ۱۹۹۰ء کی اشاعت میں شائع ہو چکا ہے

اعتراف کرکے ایک دینِ کامل کی جستجو میں اسلام کے چشمۂ صافی تک پہنچ جائیں گے۔

لیکن اس سے پہلے ایک سبق خود ہندوستان کے مسلمانوں کو سیکھنا ہوگا۔ آج جب ہم اکثریتی فرقہ کے بعض افراد کی طرف سے طاقت کے زور پر مسجد کو گرانے کی کوششوں، بے گناہ مسلمانوں کے قتل کیے جانے اور لوٹ مار کی حرکتوں پر بے چینی محسوس کریں تو ہم کو اپنے گریبان میں منھ ڈال کر یہ بھی تو دیکھنا ہوگا کہ خود مسلمانوں کے ایک فرقہ والوں کا طرزِ عمل خود اپنے ہی مذہب کے دوسرے فرقہ کے افراد کے ساتھ کیسا رہا ہے۔ کہیں سُنّی شیعہ تنازعہ، دیوبندی بریلوی جھگڑا مثلاً خود شیعوں میں نقّنی سعیدی جھگڑے وغیرہ۔ کیا ان جھگڑوں میں وہی ذہنیت کارفرما نہیں ہے جو گومتی اکسپریس سے ڈاڑھی والوں کو اتار کر قتل کر دینے والوں کی تھی۔ اگر صرف گومتی اکسپریس والے واقعہ سے ہی ہندوستان کے مسلمان سبق حاصل کرلیں اور سوچیں کہ اگر مذہب کے اختلاف پر یہ حرکتیں درست نہیں ہیں تو پھر نظریاتی اختلاف یا محض فروعی اختلاف کی بنیاد پر مسلمانوں کا ایک گروہ کیونکر دوسرے کلمہ گو کو اذیت پہنچا سکتا ہے۔

اگر ایل۔کے۔اڈوانی، بال ٹھاکرے، اشوک سنگھل اور اوما بھارتی ہمارے نزدیک قابلِ مذمت ہیں تو جن لوگوں نے مسلمانوں کے ایک فرقہ کے ایک گروہ کو دوسرے گروہ سے لڑایا، اُن کو تو اور بھی برا قرار دیا جانا چاہیے۔ درحقیقت مذہب کی بنیادوں پر نفرت کی دیواریں اٹھانے والے انسانیت کے دشمن ہیں وہ خواہ کسی بھی لباس میں ہوں۔

جس طرح ایک کسان اپنے کھیت کی فالتو گھاس اور کانٹے صاف کرتا

ہے اسی طرح ہر فرقہ کے مسلمانوں کو اپنے یہاں کے نفرت کے بیوپاریوں سے چھٹکارا حاصل کرنا ہوگا۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ جو پوری ایک جماعت کو گمراہ کرنے کا باعث ہیں اور اللہ و رسول کا نام لے کر مذہب کے نام پر مذہب کی جڑوں کو کھوکھلا کر رہے ہیں۔ جب ہم داخلی محاذ پر ان طاغوتوں سے چھٹکارا حاصل کریں گے تب اسلام کا چمن اس لائق ہوگا کہ غیر مذہب کے افراد اس کی طرف راغب ہوں۔

اس طرح آج ہندوستان کے مسلمان ایک دوراہے پر کھڑے ہیں۔ اگر وہ آپسی نظریاتی اور مسلکی اختلافات سے اوپر اُٹھ کر ایک متحد اور منظم جماعت کی صورت میں ابھر کو سامنے آئیں گے تو وقت کے دھارے کو بدل دیں گے اور ایک مسلم ہندوستان کی تشکیل کریں گے۔ لیکن اگر خدانخواستہ حالات سے کوئی سبق نہیں سیکھا اور یوں ہی افراتفری میں پڑے رہے تو تباہ ہوجائیں گے۔

ہمارے پیش نظر یہ حقیقت رہنی چاہیے کہ کسی بھی مسلک کا مسلمان ہو وہ بہرحال مسلمان ہے اور رسول اکرمؐ کا اُمتی ہے اور حق پہ ہے۔ مسالک کے فرق یا روایتوں کے فرق کو ایمان و کُفر کا فرق قرار دینا جہالت و نادانی ہے۔ جس دن یہ سبق ہندوستان کا مسلمان سمجھ لے گا وہی دن ہندوستان کے روشن اسلامی مستقبل کا پہلا دن ہوگا۔ ہم اس دن کی آمد پر مکمل یقین و بھروسہ رکھتے ہیں۔

استخارہ کی رسم

جس طرح منگنی، مانجھا، سانچق، چوتھی وغیرہ شادی کی رسمیں ہیں اسی طرح کی ایک رسم "استخارہ" رائج ہو گئی ہے۔ رشتہ کی بات چیت شروع ہوتے ہی کسی "جناب" کے پاس لڑکی و لڑکے کے نام و ولدیت کا پرچہ پیش کیا جاتا ہے اور وہ تسبیح کے دانوں کے طاق و جفت کی بنیاد پر اس رشتہ کو بہتر یا منع قرار دیتے ہیں۔

اگر ہم استخارہ کے سلسلے میں حقیقی علماء کی تحریروں سے رجوع کریں اور تھوڑا سا بھی ذہن پر زور دیں تو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ جس استخارہ کی تاکید معصومین علیہم السلام نے فرمائی ہے اس میں اور جو چیز استخارہ کے نام پر ہمارے یہاں رواج پا گئی ہے اس میں آسمان و زمین کا فرق ہے۔ اس سلسلہ میں جو صاحب رجوع کرنا چاہیں تو آیت اللہ دستغیب شیرازی کی تصنیف "استعاذہ" کے صفحات ۸۳ تا ۹۱ ملاحظہ فرمائیں۔

استخارہ ان موضوعات میں سے ہے جن کے بارے میں مسلمانوں کے تمام مکاتب فکر کی روایات کے مطابق نبیؐ سے بہت تاکید وارد ہوئی ہے۔ چنانچہ آپؐ کے ارشاد کے مطابق کسی بھی چھوٹے یا بڑے کام میں اسے ترک نہ کرنا چاہیے۔

یہ مضمون پیام نو مورخہ ۴ جنوری ۱۹۹۱ء کی اشاعت میں شائع ہو چکا ہے۔

امیر المومنین جناب علیؑ کا فرمان ہے "یمن کے سفر میں جس پر میں نبی علیہ السلام کے حکم پر روانہ ہوا تھا، حضور علیہ السلام کے دیگر ارشادات میں ایک یہ تھا کہ:۔
"اے علی اس سفر کے دوران کسی مقام پر بھی استخارہ ترک نہ کرنا"
ہر امامؑ نے دوسرے امامؑ کو استخارہ کی اتنی ہی تاکید فرمائی ہے جتنی قرأت قرآن کی۔

یہ استخارہ جس کی اتنی تاکید وارد ہوئی ہے اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تسبیح کے دانوں کا طاق، جفت دیکھ لیا جائے بلکہ اس کا مقصد طَلَبُ الْخِیَرَۃِ مِنَ اللّٰہِ (اللہ تعالیٰ سے خیر کا طلب کرنا ہے) ہر کام جو آپ کریں اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے خیر و رضا طلب کریں۔
یعنی درحقیقت استخارہ ایک دعا کا نام ہے۔ آج جو استخارہ دکھوایا جاتا ہے اس میں دعا کی کیفیت نہیں ہوتی ہے اور اس کی حیثیت محض فال دکھوانے کی ہو کر رہ گئی ہے۔
آیۃ اللہ دستغیب شیرازی فرماتے ہیں کہ علامہ باقر مجلسی نے ایک مستقل کتاب "مفاتیح الغیب" کے نام سے تالیف کی ہے جس میں انھوں نے استخارہ کے متعلق وارد شدہ تمام روایات کو جمع کیا ہے۔ اس موضوع پہ دوسرے علماء نے بھی رسالے تحریر کیے ہیں۔ لیکن لوگوں کی اکثریت حقیقت سے بے خبر ہے۔ علاّمہ مرحوم مذکورہ بالا کتاب کے شروع میں استخارہ کی خوبی اور ضرورت کے بارے میں چند روایات نقل کر کے تمام امور میں اللہ تعالیٰ سے خیر و صلاح طلب کرنے کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

جاننا چاہیے کہ استخارہ کی چند اقسام ہیں:۔

۱۔ ہر اس کام میں جس کا آپ ارادہ کریں، اللہ تعالیٰ سے وسیلہ پکڑیں اور اس سے امر میں خیر طلب کریں اور بعد میں جو کچھ بھی اس کا انجام ہو اُس سے راضی بہ رضائے خدا رہیں اور سمجھ لیں کہ خیر و صلاح اسی میں ہے۔

۲۔ اللہ تعالیٰ سے طلب خیر کرنے کے بعد اپنے دل کی طرف متوجہ رہیں اور جیسا وہ چاہے ویسا کریں۔

۳۔ اللہ تعالیٰ سے طلب خیر کے بعد کسی مومن سے مشورہ کریں اور جیسا وہ کہے ویسا عمل کریں

۴۔ استخارہ قرآن سے یا تسبیح سے یا پرچیوں سے یا گولیوں سے کریں۔ اس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

پھر کہتے ہیں: "بہت سی احادیث پہلی قسم کے استخارہ کی طرف اشارہ کرتی ہیں اور بہت سے علماء کرام مثلاً شیخ مفید، محقق طوسی اور ابن ادریس کو قسم چہارم میں تائل ہے۔ لیکن چونکہ احادیث ہر چہار قسم کے بارے میں وارد ہیں لہٰذا کسی سے بھی انکار ممکن نہیں۔ بہرحال استخارہ کی پہلی تین صورتیں بہترین ہیں جو کہ ہمارے زمانے میں تقریباً متروک ہو چکی ہیں۔

دوسرے کے لیے استخارہ کے بارے میں آیت اللہ دستغیب لکھتے ہیں: "یہ جو ہمارے زمانے کی رسم ہو گئی ہے کہ قرآن مجید کے اوپر نیک یا بد لکھ دیا جاتا ہے یا کسی عالم کے پاس استخارے کے لیے جاتے ہیں، علامہ مجلسی فرماتے ہیں کہ ہمارے پاس نمونے کے طور پر کوئی ایسی روایت موجود نہیں ہے کہ کبھی کوئی شیعہ امامؑ کی خدمت میں استخارے کی غرض سے آیا ہو۔ اس کام کی کوئی اصل نہیں ہے۔

استخارہ کی بنیاد

گذشتہ مضمون میں عرض کیا کہ استخارہ کے معنیٰ اللہ سے خیر طلب کرنا ہے۔ یوں تو انسان کو ہر کام میں اللہ سے خیر طلب کرتے رہنا چاہیے مگر خاص طور پر مندرجہ ذیل صورتوں میں استخارہ کی حاجت ہوتی ہے۔

(۱) جب ایک سے زیادہ امور میں سے کسی ایک کو منتخب کرنا ہو تو اس بات کی اللہ سے دعا کرنا کہ تو میری رہنمائی فرما کہ میں اس راہ کا انتخاب کروں جس میں تیری رضا ہو اور جو میرے لیے باعثِ خیر و برکت ہو۔ اس قسم کی مثال دیکھنا ہو تو امام حسینِ علیہ السلام کو اس منزل پر دیکھیے کہ جب مدینہ کے حاکم نے اُن سے یزید کی بیعت طلب کی ہے۔ امام قبر رسولؐ پر تشریف لاتے ہیں، دو رکعت نماز ادا کرتے ہیں اور بارگاہِ الٰہی میں دعا کرتے ہیں "میں نیکی کو دوست رکھتا ہوں اور برائی سے بیزار ہوں۔ جو معاملہ مجھے درپیش ہے اُس سے تو بخوبی واقف ہے۔ لہٰذا تو مجھے اپنی رضامندی کرامت فرما دے۔" اس کے بعد امام حسینؑ قبر رسولؐ پر سر رکھ کر گریہ کرتے کرتے سو جاتے ہیں۔ خواب میں رسول اکرمؐ تشریف لاتے ہیں اور اپنے نواسہ کو آئندہ کے طریقۂ کار سے آگاہ کرتے ہیں۔

(۲) دوسری صورت یہ ہے کہ ہم کسی دشوار یا پُرخطر امر کو انجام دے رہے

یہ مضمون پیامِ نو مورخہ ۲۵ جنوری ۱۹۹۱ء کی اشاعت میں شائع ہو چکا ہے۔

ہیں اور ہم کو نہیں پتہ کہ اس کا انجام کیا ہوگا۔ مثلاً کسی سفر پہ جانا، مقدمہ، جنگ یا آپریشن وغیرہ۔ ان دشواریوں اور خطرات میں ثابت قدم رہنے اور اللہ سے خیر و عافیت کی دعا کرتے رہنا ہی استخارہ ہے۔ یمن کے سفر پر حضرت علی علیہ السلام کو روانہ کرتے وقت رسول اکرمؐ نے جو ہدایت فرمائی تھی کہ "اے علی اس سفر کے دوران کسی مقام پہ بھی استخارہ ترک نہ کرنا" سے مراد استخارہ کی یہی قسم ہے کہ ہر منزل پر یادِ خدا اور کیفیت دعا میں رہا جائے۔ امام حسینؑ کا مدینہ سے مکہ اور مکہ سے کربلا تک کا پورا سفر اس استخارہ کی عملی تصویر ہے۔ یہاں تک شبِ عاشور کی مہلت مانگ کر یادِ خدا میں بسر کرنا اور رضائے الٰہی کی دعا کرنا استخارہ ہی ہے۔

(۳) تیسری صورت یہ ہے کہ ہم مصیبتوں میں گرفتار ہوں، مظالم کا نشانہ بنائے جا رہے ہوں مگر ان سب بلاؤں کا مقابلہ کرتے ہوئے ہم اللہ پہ بھروسہ اور اعتماد رکھتے ہوئے اللہ سے اس بات کی دعا کرتے ہیں کہ ہم پر لاکھ ستم ڈھائے جائیں، مصائب ڈھائے جائیں مگر یہ کہ ان سب مظالم کے باوجود دین کی بقا اور ملت کی بہبودی کی کوئی راہ نکل آئے۔ اس قسم کی مثال دیکھنا ہو تو شیخ مفید علیہ الرحمہ نے جناب علی اصغر کی شہادت پر امام حسین علیہ السلام کی جو کیفیت درج کی ہے اس کو ملاحظہ فرمائیں۔ امام حسین علیہ السلام کے ہاتھوں پر جناب علی اصغر کا لاشہ ہے۔ چلّو بے شیر کے خون سے بھر جاتا ہے۔ امام حسینؑ اس خون کو زمین پر گرا دیتے ہیں اور بارگاہِ ایزدی میں مناجات کرتے ہیں "اے میرے پروردگار! اگر تیری نصرت ابھی میرے شاملِ حال نہیں ہے تو یہ

اس وجہ سے ہو کہ تیری مشیت فوری مدد پر ترجیح رکھتی ہو"۔ یعنی امام حسینؑ یہ فرمارہے ہیں کہ مجھ پر مظالم ڈھائے جارہے ہیں اور میں اس نرغۂ اعداء میں یکہ و تنہا مصیبتوں کو برداشت کر رہا ہوں اور تجھ سے دعا کر رہا ہوں کہ ان حالات کے ذریعہ تیری مشیت دین حق کی نصرت اور میرے نانا کی امت کی اصلاح کے لیے بہتر راہ پیدا کرے۔

اس طرح استخارہ کی حقیقی بنیاد اللہ سے خیر کو طلب کرنا اور راضی بہ رضائے الٰہی رہنا یعنی توکل علی اللہ ہے۔ صحیفۂ کاملہ کی وہ دعا جس کا عنوان ہی "دعائے استخارہ" ہے۔ آپ اس دعا کو غور سے پڑھیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ائمہ معصومین علیہم السلام ہم کو معرفت الٰہی کی کن منزلوں سے روشناس کرانا چاہتے ہیں اور ہم ہیں کہ جہالت اور تاریکی کو اپنا مقدر بنانے پر بضد ہیں۔ استخارہ ہمارے نزدیک محض تسبیح کے دانوں کا طاق و جفت دکھوانے کی رسم بن کر رہ گیا ہے جبکہ درحقیقت یہ ایمان کا تقاضہ اور توکل علی اللہ کا مظہر ہے۔

شادیوں میں استخارہ

لڑکیوں کی شادی آج ایک بہت بڑا سماجی مسئلہ ہے۔ شریعت کا تقاضہ ہے کہ شادی میں تاخیر نہ کی جائے۔ مگر اب جو ڈھرا بن گیا ہے اس کے مطابق جلدی رشتے نہیں ملتے ہیں۔ اب اگر خوش قسمتی سے کسی لڑکی کے لیے ایک سے زیادہ پیغام آئے ہوں تو اس میں بہتر کا انتخاب کیا جائے گا اور اللہ سے یہ دعا کی جائے گی کہ بارِ الہٰا اس رشتے کو لڑکی کے حق میں باعث خیر و برکت قرار دے۔ اس کے لیے والدین خود کوئی رائے قائم کریں یا کسی معتبر شخص سے مشورہ کریں۔ لیکن ذرا آپ تصور کریں کہ کسی لڑکی کا سن پچیس تیس برس کا ہو گیا ہو اور تب کوئی پیغام آیا ہو اور لڑکی کے والد صاحب لڑکے اور لڑکی کے نام کا پرچہ لے کر کسی جناب کے پاس پہنچیں جو حالات سے قطعی بے خبر ہیں۔ جن کا واحد ذریعہ اُس تسبیح کے دانے ہیں جو ان کے ہاتھ میں ہے اور وہ آنکھ بند کر کے کچھ دانے پکڑتے ہیں اور ان دانوں کے طاق و جفت کی بنیاد پر فیصلہ سُنا دیتے ہیں کہ استخارہ منع آیا ہے۔ چلیے بات ختم ہو گئی۔ اب اگر کوئی اور رشتہ نہ آیا تو سمجھیے کہ لڑکی زندہ دفن ہو گئی۔

علماء کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ عامۃ الناس کو علم عطا کریں۔ لیکن جب علمائ کا طبقہ پیشہ ور بن جاتا ہے تو بجائے حصولِ علم اور تعلیم کے وہ لوگ رسومات کی

یہ مضمون پیامِ نو مورخہ یکم فروری ۱۹۹۱ء کی اشاعت میں شائع ہو چکا ہے۔

انجام دہی میں لگ جاتے ہیں (جیسے کہ ہمارے یہاں علماء کا کام بچوں کی بسم اللہ، نکاح وطلاق کا پڑھنا، استخارہ دیکھنا، نماز جماعت و میت پڑھانا رہ گیا ہے۔) ایسی صورت میں علم عطا کرنے کے بجائے عوام کو فریب دینے کے نئے نئے طریقے ایجاد کیے جاتے ہیں۔

لہٰذا جب رشتوں کا ملنا دشوار ہونے لگا تو "تاریخ وار استخارہ" ایجاد کر لیا گیا۔ یعنی رشتے کے ختم ہو جانے کا خطرہ بھی نہ رہا اور رسم استخارہ بھی برقرار رہی۔

قرآن اور احادیث ہم کو جس بات کی تعلیم دیتے ہیں وہ ہے معاملات میں لوگوں سے مشورہ کرنا اور جب غور و فکر اور مشورہ سے کوئی بات طے کر لی تو پھر اللہ پر بھروسہ کرتے ہوئے اس پر عمل کرنا۔ اگر خدا نخواستہ کوئی مادی نقصان پہنچے تو اسے اللہ کی مشیت قرار دیتے ہوئے صبر و شکر کے ساتھ برداشت کرنا۔

آیت اللہ دستغیب شیرازی لکھتے ہیں: "سب سے بہتر وہ مشورہ ہے جو نص قرآن مجید (وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ) کے مطابق ہو اور وہ ہر شخص سے نہیں بلکہ اس شخص سے کیا جائے جو

۱۔ عاقل زیرک اور دور اندیش ہو۔ بنابریں بے وقوف آدمی سے مشورہ جائز نہیں۔

۲۔ دین دار اور متقی ہو۔ بے دین یا دین سے بے پروا شخص سے مشورہ نہیں کرنا چاہیے۔ جو شخص اللہ تعالیٰ سے خیانت کرتا ہو وہ بھلا آپ کے ساتھ کب دیانت برت سکتا ہے۔

۳۔ آپ کا محب، دوست اور خیر خواہ ہو۔ ایسے انسان سے جو آپ کا دشمن

ہو اور آپ کا خیر خواہ نہ ہو، مشورہ سے گریز کریں۔

۴۔ آپ کا راز دار ہو اور اسے دوسروں پر فاش نہ کرے۔

اگر کسی شخص میں یہ چار صفات ہوں۔ اس سے ضرور مشورہ کیجیے۔ وہ خدا جس سے آپ نے طلب خیر کیا ہے اس شخص کی زبان سے آپ کو اس امر کی خیر و صلاح کے بارے میں مطلع فرمائے گا۔

علامہ مجلسی علیہ الرحمہ نے حضرت امام رضاؑ سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا:

"میرے والد بزرگوار جناب موسیٰ بن جعفر الصادقؑ باوجود اس کے کہ خود عاقل ترین زمانہ تھے، کبھی اپنے غلام سے بھی مشورہ فرماتے تھے۔ مثلاً کسی امر کا ارادہ فرماتے تو اپنے خیر اندیش غلام سے مشورہ فرماتے اور اگر اس کام میں مصلحت ہوتی تو اُسے انجام دیتے۔ آپ سے ایک دفعہ کہا گیا کہ آپ امام زمانہ ہو کر ایک غلام سے مشورہ کرتے ہیں۔ مطلب یہ تھا کہ امام زمانہ ہونے کی حیثیت میں آپ کو ہر چیز کا ہر شخص سے زیادہ واقف ہونا چاہیے۔ آپ نے فرمایا۔ تم کیا جانو کیا یہ ممکن نہیں کہ اللہ تعالیٰ میری خیر و صلاح کو اس کی زبان پر جاری فرمادے۔"

لہٰذا جن امور میں انسان متردّد و متحیر ہو اُن میں سے حسب روایہ نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم و ائمہ طاہرینِ معصومین اور حسب فرمودہ صریح قرآن مجید عمل کرنا چاہیے۔

نعمتوں کا حساب

قرآن کریم کی سورۂ تکاثر کی آخری آیت میں قیامت کے دن کی پرسش کا تذکرہ کرتے ہوئے ارشاد ہوا:

ثُمَّ لَتُسْئَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيمِ ۝

"پھر تم سے اس دن (تمھیں عطا کی گئی) نعمتوں کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔"

اب جو بھی نعمتیں ہم کو عطا ہوئی ہیں ان نعمتوں کے بارے میں ہم کو یہ دیکھنا ہوگا کہ ہماری روش، ان نعمتوں پر اللہ کا شکر ادا کرنے کی ہے یا یہ کہ ہم کفرانِ نعمت کے مرتکب ہو رہے ہیں۔

سب سے بڑی نعمت "عقل" ہے کہ جس کی بنیاد پر انسان دیگر مخلوقات سے ممتاز ہے۔ پھر یہ اللہ کا کرم ہے کہ اُس نے ہم کو اُمتِ محمدی میں قرار دیا جس کے باعث ہمارے پاس تمسک اختیار کرنے کے لیے قرآن کریم اور اہل بیت اطہار علیہم السلام کے ایسے دو منارۂ ہدایت موجود ہیں۔ ہماری قومی زندگی کو مربوط کرنے اور اللہ کی کتاب و سیرتِ معصومین سے فیض حاصل کرنے کے لیے ذکرِ معصومینؑ کا ذریعہ مجالس و محافل کی صورت میں موجود

یہ مضمون پیامِ نو مورخہ ۸ر فروری ۱۹۹۱ء کی اشاعت میں شائع ہو چکا ہے۔

ہے۔ کیا کوئی صاحب یہ گمان کر سکتے ہیں کہ روزِ قیامت ہم سے ان عظیم نعمتوں کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا جائے گا؟

عقل وہ ہے کہ جس کے ذریعہ حق کی شناخت اور اللہ کی عبادت کی جائے۔

قرآن کریم اور سیرتِ معصومین علیہم السلام صراطِ مستقیم کی ہدایت کرتے ہیں۔ ہم اپنی عقل کو استعمال کرکے جہاں اپنی روش میں کوئی کجی پائیں تو اُسے فوراً کتاب و سیرت کے مطابق درست کرلیں۔ تحریک دین فہمی کا مقصد افرادِ ملت کو اسی جانب متوجہ کرنا ہے۔ نہ ہم اندھی تقلید کے قائل ہیں اور نہ ہی علماء پرستی ہمارا مسلک ہے۔ کیونکہ ہم لوگ اس بات کو محسوس کرتے ہیں کہ وقت کے ساتھ کچھ فالتو رسمیں اور غلط رجحانات معاشرہ میں سرایت کر گئے ہیں جس کے باعث ہماری طرزِ زندگی اور سیرت معصومین میں دوری پیدا ہوگئی ہے۔ لہذا ہمارے لیے واجب و لازم ہے کہ اپنی اصلاح کریں جس طرح کسی کھیت میں سبزی کے ساتھ فالتو گھاس پھوس نکل آتی ہے تو کاشت کار کا فریضہ ہے کہ اپنے کھیت کی نراج کرکے فالتو گھاس پھوس وغیرہ کو دور کردے۔ اسی طرح قوموں کو خود محاسبہ کرکے اپنی اصلاح و تعمیر نو کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔ اس اصلاح اور تعمیر کی مخالفت کرنے والوں کی مثال اس بے وقوف کاشتکار کی طرح ہے جو اپنے کھیت کی گھاس پھوس کو دور نہ کرے یا اپنی بے وقوفی سے گھاس پھوس کو اصل سبزی اور پیداوار سمجھ کر اس کو دور کرنے کی مخالفت کرنے لگا۔

اگر کسی کے سامنے کوئی حق بات پیش کی جائے اور وہ اس بات کو محض

اس بنیاد پر قبول کرنے سے انکار کر دے کہ جو بزرگوں سے ہوتا آیا ہے بس وہی ہم مانیں گے یا یہ کہ ہم فلاں مولانا یا شخصیت کے اندھے مقلد ہیں اور کیونکہ وہ اس بات کو نہیں مانتے ہیں لہٰذا ہم بھی نہیں مانیں گے تو آپ خود فیصلہ کیجیے کہ ایسا شخص اللہ کی عطا کردہ نعمتوں کا کفران کر رہا ہے یا شکران کر رہا ہے؟

ہم اس بات کو مانتے ہیں کہ اگر لکھنؤ کے علماء اور خطباء اپنی عقل کو استعمال کرتے اور خود قرآن اور اہل بیت علیہم السلام سے متمسک رہتے تو آج ہماری معاشرتی زندگی تعلیمات محمدی کا آئینہ ہوتی مگر آپسی اختلافات اور بغض وحسد کا ماحول اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ ہمارے معاشرہ کی امتیازی خصوصیت ایمان نہ ہو کر نفاق ہے۔ یہاں کس طریقہ سے فروعی اختلافات کی بنیاد پر دوسرے کو دشمنِ اہلِ بیت یا کافر قرار دیا جاتا ہے یہ ہر شخص پر عیاں ہے۔ اپنی نفرت کا اظہار کرنے کا آسان طریقہ یہ رائج ہو گیا ہے کہ دوسرے کے سلام کا جواب نہ دیا جائے۔ کیا یہ روش قرآن اور سیرت کے مطابق ہے؟ آئیے ذرا اس سوال کا جواب قرآن سے معلوم کریں۔ سورہ نساء کی ۹۴ آیت میں ارشاد ہوا:

وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ اَلْقٰى اِلَيْكُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا ج

"اور جو تمھیں سلام کرے اس سے یہ نہ کہو کہ تم مومن نہیں ہو۔"

یعنی جو تمھیں سلام کرے تو اس کے سلام کو اس کے ایمان کی دلیل قرار دے لو اور اُسے مومن تصور کرو۔

سلام کے جواب کا کیا انداز ہونا چاہیے اس کے لیے سورہ نساء کی ۸۶ ویں

آیت میں واضح حکم موجود ہے :

وَاِذَا حُیِّیْتُمْ بِتَحِیَّۃٍ فَحَیُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْھَا اَوْ رُدُّوْھَا ط

"اور جب کوئی شخص تمھیں تحیہ (اور سلام) کہے تو اس کا جواب بہتر انداز سے دو یا (کم از کم) اسی طرح کا جواب دو۔"

اس آیۂ کریمہ میں لفظ "تحیت" دوسرے کے لیے حیات و زندگی کی دعا کرنے کے معنیٰ میں ہے۔ چاہے یہ دعا سَلَامٌ عَلَیْكَ کی صورت میں ہو جس کے معنیٰ "خدا تجھے سلامت رکھے" ہیں یا حَیَّاكَ اللّٰہُ "خدا تجھے زندہ رکھے" یا اس قسم کے اور الفاظ سے ہو۔ یہاں یہ بات بھی واضح رہنی چاہیے کہ سلام علیك کے جواب میں "آداب عرض" کہنا مناسب نہیں ہے۔ بلکہ سلام کا جواب سلام ہی ہے۔

معصومین علیہم السلام سلام اور جواب سلام کے بارے میں کتنا حساس تھے اس کو واضح کرنے کے لیے دو ارشادات پیش ہیں :

امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ خدا فرماتا ہے :

"بخیل وہ ہے جو سلام کرنے میں بخل سے کام لے۔"

دوسری حدیث میں امام باقرؑ سے منقول ہے :

"افشاء سلام کرنے والے کو خدا دوست رکھتا ہے۔" (افشاء سلام سے مراد مختلف افراد کو سلام کرنا ہے۔)

اب آپ ان ارشادات کی روشنی میں خود غور کریں کہ جن ذوات مقدسہ کے نزدیک سلام کرنے میں بخل کرنا یا سلام کا جواب نہ دینا اتنا معیوب ہو تو

وہ ہمارے معاشرہ کے آپسی طعن اکھڑ اور گالم گلوج کو کب برداشت کریں گے پھر خود ذکر معصومین علیہم السلام کے نام پر منعقد ہونے والی مجالس و محافل میں بھی اگر یہی بے جا روش اپنائی جائے تو کیا یہ اُن ذواتِ مقدسہ پر ظلم نہیں ہے ؟

اُمّید افزا خطبہ

گذشتہ جمعہ (بتاریخ ۸؍فروری ۱۹۹۱ء) کو نماز جمعہ کے خطبہ میں مولانا ڈاکٹر سید کلب صادق صاحب قبلہ نے اس بات کو واضح کیا کہ آج کا دور یہ بتانے کا ہے کہ محبت اہل بیتؑ کے کیا تقاضے ہیں؟ کون محب اہل بیت ہے اور کون محب اہلِ بیت نہیں ہے؟ انھوں نے فرمایا کہ اگر کردار کے ساتھ محبت اہلِ بیت کا دعویٰ ہے تو ایمان ہے اور اگر کردار درست نہیں ہے تو پھر محبت کا دعویٰ ایک جھوٹ اور دھوکہ ہے۔ انھوں نے اس سلسلہ میں دو افسوسناک واقعات کو بطور مثال پیش کیا۔ ایک واقعہ تھا چند ماتم داران کا جوا کھیلنا اور پھر اس پر آپس میں جھگڑا کرنا اور دوسرا افسوسناک واقعہ تھا ایک شیعہ کا دوسرے شیعہ کو بم مار کر قتل کر دینے کا۔

مولانا کلب صادق صاحب نے اس سلسلہ میں حضرت علی علیہ السّلام کے اس ارشاد کو پیش کیا جس میں حضرت علیؑ نے دورِ رسالت مآبؐ کی جنگوں کا موازنہ اپنی خلافت ظاہری کے دور کی جنگوں سے کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ وہ جنگیں تنزیلِ قرآن پر تھیں اور یہ جنگیں تاویلِ قرآن پر ہو رہی ہیں۔ یعنی حضرت علیؑ کا یہ فرمانا تھا کہ رسول اکرمؐ کے دور میں میں نے ان لوگوں سے

یہ مضمون پیامِ نو مورخہ ۱۵؍فروری ۱۹۹۱ء کی اشاعت میں شائع ہو چکا ہے۔

جنگ کی تھی جو قرآن کا انکار کر رہے تھے۔ مگر اب ان سے جنگ کرنا پڑ رہی ہے جو قرآن کو اللہ کا کلام تو مان رہے ہیں مگر روح قرآن کے منکر ہیں اور قرآن کے مطابق عمل نہیں کر رہے ہیں۔ اسی طرح ایک زمانہ تھا کہ جب اہلِ بیت علیہم السلام کی عظمت اور ان کی محبت کی اہمیت کو دیگر مسالک کے مسلمانوں کے سامنے اجاگر کرنا تھا مگر آج کے وقت کا تقاضہ ہے کہ جو لوگ محبتِ اہلِ بیتؑ کی اہمیت کو مانتے ہیں ان کو بتایا جائے کہ محبت اہلِ بیت کے کیا تقاضے ہیں۔ کون حقیقی محبِ اہلِ بیتؑ ہے اور کون محض دکھاوا کر رہا ہے؟

جن لوگوں کی نگاہوں سے پیامِ نو کی تحریریں گذری ہیں وہ بخوبی واقف ہیں کہ ہمارا شروع سے موقف یہی رہا ہے کہ لوگوں کو بیدار کیا جائے، اُن کو اُن کی ذمہ داریاں یاد دلائی جائیں۔ انھیں بتایا جائے کہ محض زبان سے محبتِ اہلِ بیتؑ کا دعویٰ کرنا یا اپنے کو شیعہ کہنا کافی نہیں ہے بلکہ ہم کو اپنے محبِ اہلِ بیت اور شیعہ ہونے کی دلیل اپنے کردار اور عمل سے دینی ہوگی۔ ظاہر سی بات ہے کہ جب اس موضوع پر گفتگو ہوگی تو یہ "دُکھتی رگوں کو چھیڑنے" کے مترادف ہوگا۔ لوری دے کر سُلانا اور ہے اور جھنجھوڑ کر جگانا اور ہے۔ جس طرح نیند سے جگایا جانے والا ناگواری کا اظہار کرتا ہے اسی طرح شیطان کے دامِ فریب میں پھنسے ہوئے افراد عقل و فہم کی دعوت سے اذیت محسوس کرتے ہیں۔ پھر جب بے عملی اور بدکرداری کے ساتھ جنت کے خوبصورت باغات میں اہلِ بیت رسولؐ کی محبت میں پہنچا دینے کا ٹھیکہ لے لینے والے

افراد منبروں سے ہر اصلاحی تحریک کا گلا گھونٹنے کا تہیہ کیے ہوئے ہوں تو "دین فہمی" کی دعوت دینا ایک دشوار لعمل ہوتا ہے۔ مگر ہم اللہ تبارک و تعالیٰ کے شکر گذار ہیں کہ جہاں اس نے ہم لوگوں کو اس بات کی توفیق عطا کی کہ ان دشواریوں میں ثابت قدم رہیں وہیں افرادِ ملت کو بھی اس بات کی صلاحیت بخش دی کہ وہ اچھے بُرے میں تمیز کر سکیں۔ چنانچہ رفتہ رفتہ دین فہمی کی مخالفت کرنے والے لاجواب ہوتے گئے اور قوم کی تعمیر و اصلاح کی طرف افرادِ ملت کی توجہ مبذول ہو گئی۔ خاص طور پر کتنے ہی دینی موضوعات پر لوگ آپس میں گفتگو اور اظہار خیال کرنے لگے۔ مگر ابھی یہ کام ابتدائی منزل میں ہے۔ برسوں سے منبر ہی اس بات کا واحد ذریعہ رہ گیا تھا کہ افرادِ ملت کو علوم و معارف اہل بیت سے واقف کرایا جائے۔ مگر اس واحد ذریعہ کو دین سے روشناس کرانے کے بجائے خود غرض عناصر نے اپنی نفسانی خواہشات کی تکمیل اور افراد کو میدانِ عمل سے دور کرنے میں استعمال کیا۔ نام حضرت علیؑ کا لیا گیا اور رچالاکیاں معاویہ ابن ابوسفیان کی اختیار کی گئیں۔ نام حسینؑ ابن علیؑ کا لیا گیا اور ذہنوں میں یزیدیت کا زہر گھولا گیا۔ سرنامۂ کلام میں قرآن کی آیات پڑھی گئیں مگر مضامین میں قرآن کی تکذیب کی گئی محبت اہل بیتؑ کو اجرِ رسالت قرار دیا گیا مگر خود پیغام رسالت کو پس پشت ڈال دیا گیا۔ ایسے ماحول میں اگر مولانا کلب صادق صاحب یا دیگر ایسے افراد کہ جن کو اللہ نے یہ صلاحیت عطا کی ہے کہ ان کی بات توجہ کے ساتھ سنی جاتی ہے اس بات کا تہیہ کرتے ہیں کہ حق بیانی سے کام لیں گے تو یقیناً یہ ایک

امید افزا بات ہے۔

اس سلسلہ میں نمازِ جمعہ کی خصوصی اہمیت ہے۔ جو اجتماع ہر ہفتہ نمازِ جمعہ میں مومنین کرام کا ہوتا ہے اس سے بڑھ کر روح پرور اور پاکیزہ اجتماع کیا ہوگا؟ اپنے کاروبار، تجارت یا ملازمت سے وقت نکال کر عبادت الٰہی کے شوق میں باقاعدگی سے ہر ہفتہ آنے والے محبانِ اہل بیتؑ اس بات کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں کہ وہ اس سوئی ہوئی قوم کو جگائیں۔

ہم مولانا کلب صادق صاحب کی گذشتہ جمعہ کی تقریر کا خیر مقدم کرتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ وہ آئندہ خطبات میں قومی بیداری لانے کے لیے مزید جرأت کا مظاہرہ کریں گے۔

ظلم کے خلاف صف آرائی

ایک جانب ہندوستان میں فرقہ واریت کا بڑھتا ہوا جنون اور اس کے نتیجہ میں آئے دن ہونے والے فسادات اور دوسری جانب خلیج کی جنگ اور اس کے بعد عراق کی بعثی حکومت کی اپنے ہی عوام پر وحشیانہ مظالم کی خبروں نے مسلمانانِ ہند کے فکر و ذہن کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے۔ خاص طور پر حالیہ چند دنوں میں کربلا و نجف کے مزارات مقدسہ کو گولہ باری سے پہنچنے والے نقصانات اور بڑے پیمانے پر ان مقامات مقدسہ کے شہریوں کے قتلِ عام نے تمام محبانِ اہل بیتؑ کو بے چین کر دیا ہے۔

جہاں تک عراق کی بعثی حکومت کا سوال ہے تو اس کے لیے یہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ نہ شیعہ ہے اور نہ سُنّی ہے۔ عراق میں جہاں شیعوں کا خون بہایا جا رہا ہے وہیں اُن کردوں کا بھی قتل عام کیا جا رہا ہے جن کی ۹۰ فیصد تعداد سنی العقیدہ ہے۔

ظاہر سی بات ہے کہ ان مظالم پر ہر حساس دل کو بے چین ہونا اور بہتر سے بہتر طریقہ پر اپنے احساس کی ترجمانی کرنا ہے۔

اس سلسلے میں مختلف تنظیموں اور انجمنوں کی جانب سے ۲۲ر اپریل ۱۹۹۱ء

یہ مضمون پیامِ نو مورخہ ۲۲ر اپریل ۱۹۹۱ء کی اشاعت میں شائع ہو چکا ہے۔

کی مجوزہ بوٹ کلب، دہلی کی ریلی میں شرکت کے انتظامات کیے جا رہے ہیں۔

ماضی میں سعودی حکمرانوں کے ہاتھوں جنت البقیع کے روضوں کی تاراجی اور انہدام کی یاد ابھی تازہ ہے اور شہر لکھنؤ میں اس تاراجی کی یادیں ابھی بھی ہر سال ایام غم منانے کا سلسلہ جاری ہے لیکن اس طرح کا احتجاج ایک رسم تو بن سکتا ہے مگر قوم کی تقدیر بدلنے یا حالات میں انقلاب لانے کے لیے ہم کو اس احتجاج کو رسم کے دائرے سے اونچا اٹھا کر اسے معنویت عطا کرنا ہوگی۔

یعنی ۲۲ اپریل کے احتجاجی مظاہرے کو رسمی طور پر چند قرار دادیں منظور کرنے کے پلیٹ فارم کے بجائے ظلم کے خلاف منظم عملی جدوجہد کے آغاز کا پیش خیمہ ثابت ہونا چاہیے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب ہم مندرجہ ذیل نکات کو پیش نظر رکھیں:

۱۔ ظلم ظلم ہے، چاہے وہ پنجاب میں ہو یا کشمیر میں۔ ہندوستان میں ہو یا عراق میں۔ اور اگر ہمیں ظلم کے خلاف صف آرا ہونا ہے تو ہمیں اپنی بستی، اپنے شہر اور اپنے ملک میں ہونے والے ظلم کے لیے اپنی مسئولیت اور ذمہ داری کو بھی پیش نظر رکھنا ہوگا۔

۲۔ ہم نے قبرستانِ بقیع کی تاراجی پر بہت احتجاج کیا اور اب کربلا و نجف کے مزارات مقدسہ کی بے حرمتی پر احتجاج کر رہے ہیں مگر خود اپنے یہاں مساجد، امام باڑوں، کربلاؤں و دیگر اوقاف کی لوٹ کے خاموش تماشائی ہیں

۳۔ اسی طرح عراق میں مزارات مقدسہ میں صدام کی تصویروں کے آویزاں

کرنے اور اس کے فوجیوں کی حرم پاک میں موجودگی پر احتجاج کرو تو بیت المقدس
پر صیہونی قبضہ اور بابری مسجد میں رکھے جانے والے بُت اور ہونے والی
پوجا بھی ہمارے پیش نظر رہنی چاہیے۔

۴۔ کردستان کے سُنّیوں اور کربلا و نجف و بصرہ کے شیعوں کے قتل عام کے
ساتھ ہندوستان کے مختلف شہروں میں مسلمانوں کے قتل عام لوٹ مار اور
عورتوں کی بے آبروئی سے عبارت فرقہ وارانہ فسادات کی یاد بھی ہمارے
سامنے رہنی چاہیے۔

۵۔ جب ہم عراق میں علماء کو اذیت دینے، قید کرنے یا قتل کرنے کے خلاف
غم و غصہ کا اظہار کریں تو خود اپنے ہی علماء کی توہین کرنے اور اذیت دینے
کے واقعات بھی ہمارے پیش نظر رہنے چاہئیں۔

۶۔ صدر صدام حسین یا اور اسی طرح کے دیگر ظالم و جابر حکمرانوں کی نابودی
کی دعا کرتے وقت ہمیں یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ ہم خود منبر رسولؐ کو ظالموں
سے محفوظ رکھنے میں ناکام رہے ہیں بلکہ ایسے لوگوں کو ذکرِ حسینؑ کے نام
پر منبروں پر بٹھانے کے ذمہ دار بنتے ہیں کہ جو کھلم کھُلاّ گناہانِ کبیرہ کا ارتکاب
کرتے ہیں۔ منبر سے ذاتیات پر حملے، دوسروں پر طعن تشنیع، قوم میں انتشار
کو فروغ دینا اور ایسی تقریر کرنا جس سے احکامِ الٰہی کی مخالفت ہو،
ان کا شعار ہے۔ اس طرح کی تقاریر کو لوگ عبادت سمجھ کر سنتے ہیں اور
جس کے مضر اثرات شیعہ معاشرے پر پوری طرح عیاں ہیں۔ جدھر
نگاہ اٹھا کر دیکھیے بغض، حسد، نفاق، دُورُوئی، بدی، غیبت اور بے اعتمادی

کا دور دورہ ہے۔ اس طرح کے ذاکرین نے صفِ عزا کو درس گاہ حسینی کے بجائے یزیدی ذہنیت کو پروان چڑھانے کے ٹھکانے میں تبدیل کر دیا ہے۔ حضرت امام حسین علیہ السلام کا مقصد تھا کہ لوگ اللہ کی اطاعت اختیار کریں اور شیطان کی پیروی سے بچیں اور یہی ان کی یاد کا مقصد بھی ہونا چاہیے۔ مگر اس طرح کے افراد نے صفِ عزا کو وجہِ بقائے اسلام کے بجائے اسے دین سے منھ موڑنے والوں کی پناہ گاہ اور مسلمانوں کے مختلف فرقوں اور جماعتوں کے درمیان نفرت وافتراق پھیلانے کا ذریعہ قرار دے لیا ہے۔ کیا یہ حسین مظلوم پر مسلسل ظلم نہیں ہے؟

۷۔ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنی دینی و شرعی ذمہ داریوں کو ملحوظ رکھیں۔ علم حاصل کریں اور میدان عمل میں ڈٹ جائیں۔ یاد رکھیں کہ شیعہ قوم کی غرض خلقت ائمہ طاہرین علیہم السلام کی اس طرح سے پیروی کرنا ہے کہ ان کے کردار و عمل سے رسول اکرمؐ و ائمہ طاہرینؑ کی سیرت کی معرفت ہو تا کہ اس دور میں دیگر اقوام پر اللہ کی حجت تمام ہو سکے۔

آج کی کربلا

محرم ۱۴۱۲ھ کے آغاز میں محض چند دن رہ گئے ہیں، یہ دن استقبال عزا کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ ۶۱ھ میں میدان کربلا میں رونما ہونے والے اس عظیم سانحہ کی یاد تازہ ہو جاتی ہے جس میں خانوادۂ رسالت پر مظالم کی انتہا کر دی گئی۔ یہ وہ کربلا تھی جو عراق میں ہے جس کی جغرافیائی حدود معین ہیں۔ میں جس کربلا کی بات کرنے جا رہا ہوں وہ اس عراق کی کربلا سے کہیں بڑی ہے۔ یہ آج کی کربلا ہے کہ جو سرزمین عراق کے کسی خطہ تک محدود نہیں ہے بلکہ اس پورے کرۂ ارض پر محیط ہے۔ وہ کربلا کی جنگ روز عاشورہ ۶۱ھ کو لڑی گئی اور اسی دن عصر تک جاری رہی مگر آج کی جنگ ابھی جاری ہے۔

یہ آج کی کربلا مصداق ہے اس عظیم انقلابی پیغام کا کہ جو امام رضا علیہ السلام کے نامِ نامی سے منسوب ہے۔

کُلُّ یَوْمٍ عَاشُورَہ کُلُّ اَرْضٍ کَرْبَلا

"ہر روز روز عاشورہ ہے اور ہر زمین کربلا ہے۔"

یہ ایک انقلابی پیغام ہے عزادارانِ حسینؑ کے لیے کہ وہ عزائے حسینؑ کے ذریعہ نصرت حسینؑ کا درس حاصل کریں۔ اپنے معاشرہ اور سماج کا جائزہ لیں

یہ مضمون پیامِ نو مورخہ ۱۲ر جولائی ۱۹۹۱ء کی اشاعت میں شائع ہو چکا ہے۔

حق و باطل کی شناخت کریں، باطل طاقتوں کے خلاف صف آرا ہوں، حق کا ساتھ دیں اور اس طرح میدانِ عمل میں امام حسینؑ کی نصرت کریں۔ وہ لوگ جو عزائے حسینؑ تو کرتے ہیں مگر نصرت حسینؑ سے بے توجہی برتتے ہیں۔ اُن کی مثال اُن کلمہ پڑھنے والوں کی سی ہے کہ جو روح اسلام سے عاری تھے۔ چنانچہ کلمۂ رسولؐ تو پڑھ رہے تھے مگر ان کی تلواریں نواسۂ رسولؐ کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے لیے اُٹھ رہی تھیں۔ ان میں کتنے ایسے تھے کہ جنھوں نے امام حسینؑ کو قتل کرنے کے لیے منتیں مانی تھیں۔ کسی نے روزے رکھے تھے اور کسی نے مسجدیں تعمیر کرائی تھیں۔

جہاں تک دین کے ظاہری احکام پر عمل کرنے کا سوال ہے تو یزیدی فوج کے افراد بھی ان کی پابندی کر رہے تھے لیکن جو کمی تھی وہ اپنی عقل کو استعمال نہ کرنا تھا، غور و فکر سے دوری اختیار کرنا تھا۔ چنانچہ حق ان کے لیے مشتبہ ہو گیا۔ وہ لوگ قتل حسینؑ کا ایسا عظیم جرم نیکی سمجھ کر انجام دینے میں لگ گئے۔ یزید والوں کے پاس دین کا ظاہری ڈھانچہ تھا مگر دین فہمی نہ تھی اور جب دین کا فہم نہ ہو تو آدمی برا کام بھی نیکی سمجھ کر انجام دیتا ہے۔

اس طرح عزائے حسینؑ کا پہلا کام لوگوں میں دین کا فہم بیدار کرنا ہونا چاہیے تاکہ لوگ بھلے اور بُرے اور حق و باطل میں تمیز کر سکیں اور دوسرا کام یہ ہونا چاہیے کہ لوگوں میں نصرت حق کی تڑپ پیدا ہو۔ اس کو میں یوں کہوں کہ محبتِ حسینؑ کا تقاضہ ہے کہ آنکھ نمناک ہو اور دل پُرغم ہو، یعنی عزائے حسینؑ ہو اور عزائے حسین کا تقاضہ ہے کہ دین فہمی اختیار کی جائے یعنی نصرت حسینؑ ہو۔

آئیے اس مختصر تمہید کے بعد ہم آپ کو آج کی کربلا لے چلیں۔

ہر روز روزِ عاشورہ ہے اور ہر زمین کربلا ہے۔

لکھنؤ بھی آج ایک کربلا ہے۔ آج حسینؑ ہمارے درمیان نہیں ہیں مگر قتل کرنے کے لیے ان کے اصول و مقاصد تو ہیں۔ آج لاشۂ حسین تو نہیں ہے مگر ان کا دین تو پامال کر سکتے ہیں۔ آج خیامِ حسینی تو نہیں ہیں مگر لوٹنے کے لیے اوقاف حسینؑ تو ہیں۔ آج قتل کے لیے انصار حسینؑ تو نہیں ہیں مگر مقصد حسینی بیان کرنے والے تو ہیں کہ جن کو اذیت پہنچائی جاسکے۔ آج اہل حرم تو نہیں ہیں کہ جن کی تشہیر کی جائے اور طنزیہ فقرات استعمال کیے جائیں مگر ایسے افراد تو ہیں ہی کہ ذکرِ حسینؑ کی آڑ میں اُن پر طعن اچھڑ کیا جاسکے اور نفرت کو عام کیا جاسکے تاکہ عقل و فکر کو قید کیا جاسکے۔

عزاداری کو نصرت حق سے کس طرح جدا کر دیا گیا ہے اس کا عملی مشاہدہ یہاں کی کربلاؤں اور درگاہوں کی لوٹ سے آسانی سے کیا جا سکتا ہے۔ آپ نے کتنے ذاکروں سے اوقاف کی جائیدادوں کے بارے میں کچھ سُنا ہے؟ کیا آپ نے کسی بھی ذاکر کو سُنا ہے کہ جو وقف خوروں پر لعنت بھیجتا ہو یا ان کو دشمنِ اہل بیتؑ اور یزیدی قرار دیتا ہو؟ بلکہ اس کے برخلاف اُن تمام ذاکرین کو کہ جو دوسروں کے عقائد تولنے کے ماہر اور معاشرہ میں نفرت کا زہر گھولنے کے ذمہ دار ہیں، ان وقف خوروں اور بے ایمان متولیوں کے بہت قریب پائیں گے۔

جس مسلک میں محبّت، مودت اور ولایت کو خصوصی اہمیت ہو اسی مسلک کے افراد میں آپسی رنجش و نفرت کیوں ہے؟ شادی کے چند ماہ کے اندر زوجین میں علاحدگی اور طلاق کے واقعات کتنے عام ہوتے جا رہے ہیں؟ دوستی

اور الفت کے بجائے بغض و حسد کیوں؟ حسنِ ظن کے بجائے سوئے ظن ہمارا شعار کیوں بن گیا ہے؟

اگر باریک بینی سے آپ حالات کا تجزیہ کریں اور واقعۂ کربلا سے آج کے حالات کا موازنہ کریں تو آپ یقیناً ہماری بات سے اتفاق کریں گے کہ امام حسینؑ کی اصل مصیبت یہ تھی کہ دین پر مصیبت آگئی تھی۔ دین پر مصیبت اس وجہ سے آئی تھی کہ جو اہل نہیں تھا وہ تخت خلافت پر بیٹھ رہا تھا۔ آج جو دین پر مصیبت آئی ہے اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ جو اہل نہیں ہیں وہ منبر رسول پر بیٹھ رہے ہیں بجائے ہدایت کے گمراہی پھیلا رہے ہیں۔

چنانچہ حق بیانی اور جرأت اظہار جو امام حسینؑ اور ان کے ساتھیوں کا خاصہ تھا آج ہمارے درمیان نہیں رہا۔ ایک عالم دین نے مجھ سے فرمایا کہ ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم اہلِ بیتؑ کے چاہنے والوں کو اہل بیتؑ کی باتیں نہیں بتا سکتے۔

وہ عالم دین جانتے ہیں کہ منبروں سے جھوٹ بول بول کر دین کو مسخ کر کے چکنی چپڑی باتوں کے ذریعہ لوگوں کو اندھا بہرا اور گونگا بنا دیا گیا ہے۔ فکروں کو جامد کر دیا گیا ہے اور اگر ہم حق بات بیان کریں گے تو حق تو کوئی قبول نہ کرے گا الٹے ہماری جان آفت میں پڑ جائے گی۔

جہاں حق کی آواز گھونٹ دی جائے وہی کربلا ہے۔

یزیدی ذہنیت کا اگر آپ نمونہ دیکھنا چاہیں تو دین فہمی کی مخالفت میں سید محمد محسن جعفری صاحب کا کتابچہ "دین فہمی بنام غلط فہمی" دیکھیں جس کے صفحہ ۳ پر لکھتے ہیں:

"... اور ہمارے وہ عقائد و مسلّمات جن پر آج تک صرف لکھنؤ ہی نہیں بلکہ دنیا کے کسی بھی جید سے جید شیعہ عالم دین کو تنقید کرنے کی ہمت وجرأت نہیں ہوئی اس پر آج کے کچھ نام نہاد شیعہ جن کو اگر وہابی ایجنٹ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا جو شیعیت کی نقاب پہن کر ہماری صفوں میں گھس کر انتشار و اختلاف پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور ہر دن وہ ہمارے عقائد و روایات پر تنقید کرتے اور طرح طرح سے کیچڑ اچھالتے ہوئے نظر آتے ہیں ..."

اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ "دین فہمی" کی تحریروں کے ذریعہ جہاد بالقلم کا جو سلسلہ شروع کیا گیا اس کے نتیجہ میں جمود ٹوٹا ہے۔ افراد ملت کی ایک بڑی تعداد نے دینی مسائل پر گفتگو اور سوال وجواب شروع کر دیے ہیں۔ ہمارا مقصد یہ قطعی نہیں ہے کہ جو کچھ ہم کہیں اُسے لوگ آنکھ بند کر کے مان لیں۔ ہم لوگ تو اس اندھی تقلید کے مخالف ہیں۔ ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ کوئی بات قبول کرنے سے پہلے اس کی مناسب تحقیق کی جائے، دلیل طلب کی جائے تب اس کو قبول یا رد کیا جائے۔ جو ذاکرین منبروں سے "دین فہمی" کی مخالفت کیا کرتے تھے آج بحمد اللہ ان سے یہ کہنے والے لوگ ہو گئے ہیں کہ آپ منبر سے مخالفت کرنے کے بجائے مضمون کیوں نہیں لکھتے ہیں؟

نصرتِ حسینؑ

گذشتہ مضمون میں عرض کیا کہ محبّت حسینؑ کا تقاضہ ہے کہ آنکھ نمناک ہو اور دل پُرغم ہو یعنی عزائے حسین ہو اور عزائے حسینؑ کا تقاضہ ہے کہ دین فہمی اختیار کی جائے اور نصرت حق کی جائے یعنی نصرتِ حسینؑ ہو۔ اب اگر کوئی شخص محبت حسینؑ کا دعوٰی کر رہا ہو مگر مصیبت حسینؑ کا کوئی اثر اس پر نہ ہو تو ہم اسے جھوٹا تصور کریں گے، اور اگر کوئی شخص عزائے حسین میں تو انہماک اور شغف کا اظہار کرے مگر نصرتِ حق کی تڑپ اس میں نہ پیدا ہو تو یہ اس بات کا ثبوت ہوگا کہ وہ مقصد حسینؑ سے غافل ہے اور دین فہمی سے عاری ہے۔ اس میں اور یزید کے لشکریوں میں کوئی فرق نہیں ہوگا۔

یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ امام حسینؑ نے اپنی آواز استغاثہ میں یہ نہیں فرمایا تھا کہ کون ہے جو مجھ پہ گریہ کرے؟ کون ہے جو مجھ پہ ماتم کرے؟ جی نہیں بلکہ انھوں نے بار بار یہی آواز دی تھی:

"هَلْ مِنْ نَاصِرٍ يَنْصُرُنَا؟ هَلْ مِنْ مُغِيثٍ يُغِيثُنَا؟" کون ہے جو میری نصرت کرے؟ ہے کوئی مددگار جو میری مدد کرے؟"

یہ مضمون پیامِ نو مورخہ ۱۲ر جولائی ۱۹۹۱ء کی اشاعت میں، شائع ہو چکا ہے۔

حسینؑ کو نصرت کرنے والوں کی ضرورت ہے۔ حسینؑ کو مدد کرنے والوں کی ضرورت ہے۔ حسینؑ کو معلوم ہے کہ کسی بھی مذہب کا انسان ہو جس کے بھی پہلو میں ایک دردمند دل ہو گا وہ میرے مصائب پر ضرور کسک محسوس کرے گا اور اس کی آنکھ نم ہو جائے گی۔ اس میں مذہب و ملت اور عقیدہ و مسلک کی قید نہیں ہے۔ مگر جہاں تک میری نصرت کا سوال ہے تو اس کے لیے مخصوص فکر و عمل کی ضرورت ہے۔

میں مکتب اسلام کا تربیت یافتہ ہوں تو میری نصرت کرنے والے کو بھی اسی ایک خدا کا بندہ ہونا چاہیے۔ میں اپنے وقت کی طاغوتی طاقتوں کے خلاف قیام کر رہا ہوں تو میری نصرت بھی وہی کر سکتا ہے کہ جو اپنے زمانے کے طاغوتوں کو شناخت کر سکے اور ان کا مقابلہ کر سکے۔ میں اللہ اور اس کے رسولؐ کی خوشنودی کے سوا کوئی خواہش نہیں رکھتا ہوں تو میری نصرت کرنے والے کو بھی اپنی نفسانی خواہشات سے بلند ہو کر رضائے الٰہی کے حصول کو اپنا مقصود قرار دینا ہو گا۔ میں دین کی سربلندی کی خاطر وطن سے بے وطن ہونا، طعن و تشنیع، سب و شتم، تیر و تلوار کے گھاؤ اور عزیزوں اور دوستوں کا قتل سب ہی کچھ صبر و شکر کے ساتھ برداشت کر رہا ہوں۔ میری نصرت کرنے والے کو بھی ہر طرح کے ایثار و قربانی کے لیے آمادہ رہنا ہو گا۔

حسینؑ کی آواز استغاثہ آج بھی انقلاب پرور روح کی حامل ہے مگر افسوس آج صفِ عزا کا رُخ اس طریقہ سے موڑ دیا گیا ہے کہ حسینؑ کی آواز حسینؑ کے چاہنے والوں کے کانوں تک نہ پہنچ پائے۔ آج ذہنوں کو اس طرح الجھایا گیا

ہے کہ لوگ موجودہ مسائل پر غور و فکر ہی نہ کر سکیں۔ چنانچہ لوگ امام باڑوں اور کربلاؤں میں جاتے تو ہیں مگر خود ان امام باڑوں اور کربلاؤں کے حالات پر توجہ نہیں کرتے۔ خیام حسینی کی لوٹ پر گریہ کر کے سمجھتے ہیں کہ انھوں نے بہت اجر و ثواب حاصل کر لیا مگر یہ غور نہیں کرتے کہ اُن سے سنہ ۶۱ھ کی لوٹ کے بارے میں نہیں بلکہ خود اُن کے زمانے میں ہونے والی لوٹ کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔ کیا آج اوقاف کی جائدادوں کی لوٹ اور تباہی کے لیے ہماری کوئی ذمہ داری نہیں ہے؟ آج ہم خانوادۂ عصمت کی اسیری اور تشہیر پر آنسو بہاتے ہیں مگر رستم نگر میں روضۂ شبیہہ نجف میں ایک جھولا جھلاتی خاتون کی تصویر پر کوئی توجہ نہیں کرتے کہ آخر یہ کیا ہے؟ کیا عقیدت مندوں کی جیبیں ہلکی کرنے کے لیے یہ تصویر نہیں لگائی گئی ہے؟ اور کیا ایسا کرنے والے یزیدیوں سے بدتر نہیں ہیں؟

آج ہم ایسے خطباء و ذاکرین کو لمبے چوڑے القاب سے نوازتے ہیں اور ان کو بلند مقام پر بٹھاتے ہیں کہ جن کی تقاریر کھُلّم کھُلّا دین کا مضحکہ اُڑانے والی اور مسلمانوں کے درمیان تفرقہ پیدا کرنے والی ہوتی ہیں۔ ہم ان تقاریر کو عبادت سمجھ کر سنتے ہیں مگر یہ غور نہیں کرتے کہ اس طرح کی تقاریر جن سے احکامِ الٰہی کی مخالفت ہو، ذاتیات اُچھالی گئی ہو ان کا سننا ثواب کا کام ہوگا یا اُلٹے گناہ لازم آئے گا؟

آج ہم عزاداری اپنی خواہشات کی تکمیل اور دکھاوے کے لیے زیادہ کرتے ہیں اور صرف خوشنودیِ خدا یا دین کی خدمت کا جذبہ تقریباً مفقود ہو گیا ہے۔ اس طرح ذکرِ حسینؑ اور مقصدِ حسینؑ کے درمیان ایک خلیج پیدا ہو گئی

ہے نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ وہی شخص کہ جو بچپنے سے مجالس و شب بیداریوں میں شرکت کرتا رہتا ہے جب کسی وقف کا متولی یا کسی ادارہ یا انجمن کا عہدیدار بن جاتا ہے تو اپنی حیثیت کا استعمال دین کی خدمت کے بجائے اپنی ذات کے لیے کرنے لگتا ہے۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ ہماری مقبول درگاہیں، روضوں کی شبیہیں اور امام باڑے درسِ انقلاب کا مرکز بننے کے بجائے مختلف حیلوں سے عقیدت مندوں کی جیبیں ہلکی کرنے اور لوگوں کو غور و فکر سے دور کرنے کا گڑھ بنی ہوئی ہیں۔ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم نصرتِ حسینؑ کے تئیں اپنی ذمہ داری کا ادراک کریں اور اس کو نباہیں۔

ذکر اور فکر

عشرۂ محرم ۱۴۱۲ھ تمام ہوا۔ آپ نے مجالس میں شرکت کی۔ مختلف ذاکرین کے بیانات کو سماعت فرمایا۔ جب ہم کسی کی باتیں سنتے ہیں تو یہ بات ہمارے پیش نظر رہنی چاہیے کہ یہ سننا نیکی بھی ہو سکتا ہے اور گناہ بھی ہو سکتا ہے۔ اگر تقریر ہمیں اللہ سے قریب کرنے والی ہوئی تو یہ عبادت خدا میں شمار ہوگی اور اگر اس کے برخلاف تقریر سے حکم الٰہی کی مخالفت ہوئی تو یہ گناہ کا موجب ہوگی۔ امام محمد تقی علیہ السلام نے فرمایا:

"جب کوئی کسی کی بات سنتا ہے، اس کی پرستش کرتا ہے، اگر اس نے خدا کی باتیں کیں تو اُس نے خدا کی پرستش کی اور اگر شیطان کی زبان میں کہا تو شیطان کی پرستش کی۔" (بہ حوالہ تحف العقول، صفحہ ۳۳۹)

امامؑ کا یہ ارشاد ہم کو غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کسی کے ذہن میں یہ سوال اُٹھے کہ کسی کی باتیں سننے سے عبادت و پرستش کا کیا تعلق؟ اس کے لیے عرض کرنا ہے کہ جب ایک ہی مسئلہ میں دو گروہوں کی مختلف رائے ہو اور ہم بغیر کسی تحقیق و جستجو کے کسی ایک گروہ کی بات ماننے لگیں اور دوسرے گروہ کی مخالفت کرنے لگیں تو ہمارا یہ عمل اپنے آپ پہلے گروہ کی پرستش قرار پائے گا۔ کیونکہ روحِ

یہ مضمون پیام نو مورخہ ۲؍ اگست ۱۹۹۱ء کی اشاعت میں شائع ہو چکا ہے۔

پرستش کسی کی بات مان لینے کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اس طرح وہ لوگ جو سچی باتوں پر توجہ کرتے ہیں، حق کے پرستار ہیں اور جو باطل کی باتوں کو مانتے ہیں باطل کے پرستار ہیں۔

کسی زمانے میں علماء کی تقاریر صرف خوشنودیٔ خدا و رسول کے لیے ہوا کرتی تھیں۔ ہمارے علماء کرام انبیاء کرام اور ائمۂ طاہرین علیہم السلام کی سیرت کا اتباع کرتے ہوئے معاشرہ کی اصلاح پیش نظر رکھتے تھے۔ مگر بدقسمتی سے آج کل جو انداز ذاکری رائج ہو گیا ہے اس میں اللہ و رسولؐ کی خوشنودی کے بجائے سامعین کے ذوق سماعت کو ترجیح دی جاتی ہے بلکہ اکثر ایسی باتیں پڑھی جاتی ہیں جو صریحاً احکام خدا و معصومینؑ کی مخالف ہوتی ہیں مگر عوامی سطح اُس پر واہ واہ کرتی ہے۔ یاد کیجیے دربار شام کا وہ منظر کہ جب امام زین العابدینؑ و دیگر اسیرانِ اہل بیتؑ کی موجودگی میں سرکاری خطیب نے منبر پر امیرالمومنین حضرت علیؑ اور ان کے فرزندوں کے بارے میں بدزبانی کی اور معاویہ اور ان کے فرزندو کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے، اس وقت امام سجادؑ نے یزید سے کہا کہ مجھے بھی اجازت دے کہ میں بھی ان لکڑیوں پر کھڑا ہو کر کچھ کہوں جس سے خدا بھی خوش ہو اور سامعین کے لیے بھی اجر و ثواب کا باعث ہو۔ امامؑ نے منبر کو لکڑیوں سے تعبیر کیا۔ مقصد یہ تھا کہ ہر اس چیز کو جسے منبر کی شکل دے کر تقریر کے لیے رکھ دیا جائے منبر نہیں کہا جا سکتا۔ دراصل منبر کی عظمت اس کے استعمال سے ہوتی ہے۔ جب خطیب مخلوق کو خوش کرنے کے لیے خالق کی ناراضگی کی پرواہ نہ کرے تو وہ دنیا کے عوض دین کو فروخت کر دیتا ہے۔ ایسے عالم میں

وہ منبر کا وجود مٹا رہا ہوتا ہے ایسے خطیب کی باتوں کا سننا اور قبول کر لینا سوائے گناہ و بدبختی کے کچھ نہیں اور اس کا نتیجہ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں نکل سکتا کہ لوگ دین حق سے منحرف ہو جائیں۔

ہندوستان میں کتنے ہی مذاہب و مسالک کے افراد بستے ہیں، مگر جتنی تقریریں مذہب کے نام پر شیعوں میں ہوتی ہیں اتنی کسی مذہب و مسلک کے ماننے والوں میں نہیں ہوتیں مگر اس کے باوجود ہمارا معاشرہ تنزلی اور پستی سے دوچار ہے۔ اگر یہی تقریریں دین کے مطابق ہوتیں، افرادِ ملت کی فکری تربیت کرنے والی ہوتیں اور سیرت معصومینؑ اور قرآن حکیم کی روشنی میں موجودہ مسائل کا حل پیش کرنے والی ہوتیں تو آج ہمارا معاشرہ ایک مثالی معاشرہ بن جاتا۔

مگر افسوس ہے ان بدبخت ذاکرین پر کہ جنھوں نے ذہنوں کو پراگندہ کرنا اور دین کی مخالفت کرنا اپنا شعار بنا لیا ہے۔ ان لوگوں نے صف عزا کو اختلافی بنا دیا۔ آج ایک طرف دیگر مذاہب اور مسالک کے افراد ہم سے دور ہو گئے تو دوسری طرف خود شیعوں میں آپسی گروہ بندیوں کی وجہ سے عقلوں پر پردے پڑ گئے۔

اہل بیت کے حقوق غصب کرنے والوں اور خیام حسینی کے لوٹنے والوں پر تو لعنت بھیجتے ہیں مگر آج کے دور میں اوقاف لوٹنے والوں سے ہمیں کوئی کراہیت اور نفرت نہیں محسوس ہوتی۔ عام آدمی کا کیا ذکر صاحبان عمامہ منبر پر ہوتے ہیں اور بانیٔ مجلس کوئی وقف خور ہوتا ہے اور سامعین میں سب سے آگے اوقاف کا دلال عام ہوتا ہے۔ کربلا یا امام باڑہ اپنے لٹنے کی داستان

خود اپنی بے زبانی سے بیان کر رہا ہوتا ہے مگر ذاکر صاحب ان تمام باتوں سے چشم پوشی کرتے ہوئے دادِ تحسین وصولنے میں لگے رہتے ہیں۔

کیا ابھی وقت نہیں آیا ہے کہ سنجیدہ افراد اپنی ذمہ داری کو محسوس کرتے ہوئے آگے آئیں؟ موجودہ سماجی مسائل پر مل کر غور و فکر کریں؟ سورۂ سبا میں ارشاد ہوا

قُلْ اِنَّمَآ اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ ۚ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَفُرَادٰى ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا (سورہ سبا آیت ۴۶)

"(اے رسول) کہہ دو میں تمھیں صرف ایک بات کی نصیحت کرتا ہوں (اور وہ یہ کہ) تم دو دو ایک ایک کر کے اللہ کی راہ میں اُٹھ کھڑے ہو پھر فکر کرو ....."

آپ اگر قومی مسائل پر اپنے دوستوں، ساتھیوں سے گفتگو کرنا اور مختلف پہلوؤں سے کسی مسئلہ پر غور و فکر کرنا شروع کر دیں گے تو انشاء اللہ وہی وقت ہماری قوم کی حیاتِ نو کا پہلا دن ہو گا۔

فکر

فکر انسانی ذہن کی اس صلاحیت کا نام ہے جس کے ذریعہ وہ اپنے علم و مشاہدہ کو مربوط کر کے کسی نتیجہ تک پہنچنے کی جستجو کرتا ہے۔ اب یہ فکر چاہے مناظر قدرت پر غور کر کے کائنات کے مبداء و خالق کی معرفت حاصل کرنا ہو یا اشیاء کی اصل حقیقت دریافت کرنا ہو یا مستقبل کے خطرات کی نشاندہی کرنا ہو یہ سب باتیں فکر کے دائرے میں آتی ہیں۔

ہمارا دین اسلام انسان کی فکر کو بیدار کرنے اس کو صحیح سمت عطا کرنے کی جانب خصوصی توجہ دیتا ہے اور ہونا بھی چاہیے کیونکہ عمل کا دار و مدار فکر پر ہوتا ہے۔ اگر سوچنے کا طریقہ درست نہیں ہوگا تو پھر عمل بھی درست نہ ہوگا۔ اگر عمل کی مثال کسی عمارت سے دیں تو فکر کی مثال اس عمارت کی نیو بنیاد کی ہوگی جتنی بلند اور عالی شان عمارت تعمیر کرنا ہوگی اسی مناسبت سے اس کی بنیاد کو پختہ اور مضبوط بنانا ہوگا۔

جن اعتقادات کو اصولِ دین کہا جاتا ہے درحقیقت وہ عقائد انسان کی فکر کو سمت و رہنمائی عطا کرتے ہیں۔ ایک شخص جو توحید پر عقیدہ رکھتا ہے اللہ کو ایک جانتا ہے، قرآن کو اللہ کی کتاب مانتا ہے، رسول اکرمؐ کو اللہ کا پیغمبر

یہ مضمون پیام نو مورخہ ۹ اگست ۱۹۹۱ء کی اشاعت میں شائع ہو چکا ہے۔

مانتا ہے اور آخرت پر یقین رکھتا ہے اس کے عمل میں اور ایک ایسے شخص کے عمل میں کہ جو ان باتوں کو نہیں مانتا واضح فرق ہونا چاہیے۔

ایک مسلمان کے عمل کی بنیاد کلامِ الٰہی یا سنّتِ رسولؐ ہوتی ہے۔ اسے معلوم ہے کہ اس کو اپنے اعمال کی جواب دہی کرنی ہے۔ اس میں احساس ذمہ داری پایا جاتا ہے۔ اس کے نزدیک کسی عمل کا بزرگوں کے زمانے سے ہوتا آنا اس عمل کے حق ہونے کی دلیل نہیں بنتا جب تک کہ اس کی تائیدِ کلامِ الٰہی یا عملِ پیغمبرؐ سے نہ ہو جائے۔ وہ اپنا دین قرآن کریم اور سنت رسولؐ سے اخذ کرتا ہے۔ جب اس کے سامنے کوئی نئی بات پیش ہوتی ہے تو وہ اسے محض اس بنا پر رد نہیں کر دیتا ہے کہ یہ بات اُس نے پہلے کبھی نہیں سُنی یا یہ کہ فلاں فلاں علماء نے اس کو کیوں نہیں بیان کیا؟ بلکہ وہ اس بات کو قرآن و حدیث کی روشنی میں پرکھتا ہے، عقل کے میزان پر تولتا ہے اور جب بات میں وزن پایا جاتا ہے تو قبول کر لیتا ہے چاہے صدیوں کی پرانی روایات منہدم ہو جائیں۔

اس کے برخلاف کفر کا انداز یہ ہوتا ہے کہ اسے کلامِ الٰہی یا حدیثِ پیغمبرؐ سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ اپنی انا کی تسکین اور آباء و اجداد کی اندھی تقلید اس کا پیمانہ ہوتے ہیں۔ نسلاً بعد نسلٍ عقائد و مسلمات کا ایک پوٹلا ہے کہ جو وراثتاً منتقل ہوتا ہوا اس تک آیا ہے اور اس پوٹلے کی حفاظت کرنا اس کا نصب العین ہوتا ہے۔ بات کتنی ہی معقول کیوں نہ ہو، دلیل کتنی ہی مضبوط کیوں نہ ہو وہ اپنے عقائد و مسلمات کے پوٹلے کی کسی ایک شے سے بھی دستبردار ہونے کو تیار نہ ہوگا بلکہ عقل و فکر کی ہر دعوت کا جواب وہ ظلم و جارحیت سے دینے کی

کوشش کرے گا۔

یعنی کفر نام ہے فکری جمود کا جبکہ ایمان نام ہے فکر میں حرکت وارتقاء کا۔

اسلام جس انقلابی پیغام کا نام ہے اس کا پہلا کام فکروں کو جمود سے حرکت کی طرف منقلب کرنا ہوتا ہے۔ اگر تم زبان سے لا الہ الا اللہ کہہ رہے ہو تو سوچو کہ اس کلمہ کے کیا معنیٰ ہیں۔ یہ کلمہ کوئی جادو منتر نہیں ہے کہ جسے رٹ کر آنکھ بند کرکے زبان سے کہنے سے تم جہنم سے جنت کے حقدار بن گئے۔ جی نہیں، بلکہ غور و فکر کے بعد سوچ سمجھ کر کسی نتیجہ تک پہنچنے کا اظہار ہے کہ جو اس کلمہ کے ذریعہ کیا جاتا ہے۔

توحید پر عقیدہ کا اعلان درحقیقت اس بات کا اعلان ہے کہ اب نہ نفسانی خواہشات اور نہ ہی بزرگوں کی روش، نہ ہی آباء واجداد کی اندھی پیروی اور نہ ہی علماء کی اندھی تقلید بلکہ اللہ کا کلام رسولؐ کا پیغام اور عقل میری زندگی و موت کی بنیاد قرار پائیں گے۔ اگر حق بات میرے سامنے پیش ہوگی تو میں اُسے بسر وچشم قبول کرلوں گا چاہے وہ میری ذات کے ہی خلاف کیوں نہ ہو۔ اور میں باطل کے آگے کبھی نہ جھکوں گا چاہے مجھے دنیوی زندگی میں آرام وآسائش کی کتنی ہی ترغیب کیوں نہ دی جائے یا کتنا ہی بڑا دنیوی نقصان کیوں نہ برداشت کرنا پڑے۔

اللہ پر ایمان انسان کی فکر کو ایک نئی سمت عطا کرتا ہے۔ ابھی تک جو شخص صرف اپنے بارے میں، اپنی ذات، اپنا خاندان، اپنا قبیلہ، اپنی قوم اپنا ملک کی بنیادوں پر سوچتا اور عمل کرتا تھا اس میں تبدیلی یہ آجاتی ہے

کہ اب اللہ کی رضا حاصل کرنا اور دین کی سربلندی کا جذبہ ان تمام جذبات پر غالب آجاتا ہے کہ جو ابھی تک خود اس پر غلبہ حاصل کیے ہوئے تھے۔ اگر اللہ کی رضا مال خرچ کرنے میں ہے تو وہ ہنسی خوشی مال خرچ کر دے گا۔ اگر اللہ کی خوشنودی اس میں ہے کہ وہ وطن سے ہجرت کر جائے تو وہ وطن چھوڑ کر چلا جائے گا۔ اگر اللہ کی رضامندی اس میں ہے کہ وہ اپنی قوم اور خاندان والوں کے کسی عمل سے برأت اختیار کرے تو وہ اظہارِ برأت کرے گا اور اگر اللہ کی خوشنودی اور دین کی سربلندی کا تقاضہ ہے کہ وہ اپنی جان کی قربانی دے تو وہ اس سے گریز نہیں کرے گا۔

اگر سوچنے کا انداز فکرِ اسلامی سے ہم آہنگ نہیں ہے تو بھلے ہی کوئی شخص اپنے کو مسلمان کہہ رہا ہو مگر درحقیقت وہ حقیقی مسلمان نہیں ہے۔ ہماری آنکھیں کھولنے کے لیے کیا واقعۂ کربلا کافی نہیں ہے؟ جو لوگ یزیدی فوج میں شامل تھے اور جنھوں نے نواسۂ رسول کے قتل پر ایکا کر لیا تھا کیا وہ اپنے کو کافر کہہ رہے تھے؟ جی نہیں وہ تو حسینؑ اور اصحاب حسینؑ کے قتل پر نعرۂ تکبیر بلند کر رہے تھے۔ وہ اپنے کو مسلمان کہہ رہے تھے اور اپنے نزدیک ثواب کما رہے تھے۔ مگر تھا کیا، وہ زبان سے مسلمان تھے مگر ان کی فکر کافر تھی۔ انھیں سوچنے سمجھنے کا سلیقہ نہیں آتا تھا۔ وہ امام حسینؑ کے مخالف تھے مگر انھیں یہ سوچنے کی ضرورت نہیں تھی کہ آخر یہ مخالفت کیوں ہے؟ حسینؑ کا قصور کیا ہے؟ ہاں جنھوں نے یہ سوچنے کی کوشش کی اور جنھیں آخرت کی فکر تھی وہ زہیر بن قین اور حُر بن حر حسینؑ کے ساتھ شامل ہو گئے۔ اس کے برخلاف جنھیں فکر آخرت

نہیں تھی، یہ جانتے ہوئے بھی کہ حسینؑ کا خون ناحق بہایا جارہا ہے، امام حسینؑ کے درپے آزار رہے۔ ایسے افراد کی مثال خود عمر ابن سعد ہے کہ جو حسینؑ کا خون بہانا گناہ سمجھتا تھا مگر حکومتِ رَے کی لالچ نے اسے اندھا کر دیا اور آخرت کے گھاٹے پر دنیوی نفع کو اس نے ترجیح دی۔

اسلام کا تقاضہ ہے کہ انسان کی فکر بیدار رہے۔ جس راہ پر وہ چل رہا ہے اس کا محاسبہ کرتا رہے۔ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ کی صورت میں جو دعا ہر مسلمان کو کم از کم دن میں دس دفعہ مانگنی ہے اس کا مطلب ہی یہ ہے کہ آدمی صراطِ مستقیم کی معرفت حاصل کرے اور اپنی خود کی روش کا مقابلہ و موازنہ اس صراط مستقیم سے کرے کہ جس کی ہدایت کی تمنا وہ کر رہا ہے۔

کسی انسان کی فکر زندہ ہے یا مُردہ، اس کا اندازہ اُس انسان کے ذہنی رجحان سے لگایا جاسکتا ہے۔ اگر اس کو حصولِ علم سے رغبت ہے، مخالف رائے اور باتوں کو توجہ کے ساتھ سنتا ہے، اگر بات کو معقول پاتا ہے تو قبول کرتا ہے ورنہ اپنی بات کو پیش کرتا ہے اور اس کے ثبوت میں دلیل مہیا کرتا ہے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ ایک زندہ اور متحرک فکر کا حامل ہے۔

اس کے برخلاف اگر کوئی شخص علم سے رغبت نہیں رکھتا ہے اپنے نظریے سے ٹکرانے والی کسی بات کو سننے ہی کو تیار نہیں ہوتا۔ اپنی بات پر اصرار کرتا ہے مگر اپنی بات کو ثابت کرنے کے لیے کوئی دلیل نہیں رکھتا تو ایسا شخص فکری جمود کا شکار اور کافرانہ ذہنیت کا حامل ہوتا ہے۔ وہ اپنے ایمان کے جتنے بھی بلند و بانگ دعوے کرے حقیقتاً وہ کافر ہے۔ وہ اس لیے کافر قرار پائے گا کیونکہ اُس نے اللہ کی عطا کردہ عقل کی ایسی عظیم نعمت اور فکری صلاحیتوں کا کفران کیا ہے ناشکری کی ہے۔

فکر کی رہنمائی

قرآن کریم کی ایک درجن سے زیادہ آیتوں میں اس بات کا حکم دیا گیا یا اس بات کی ترغیب دلائی گئی ہے کہ لوگ ذرا اس زمین پر چل پھر کر دیکھیں کہ اللہ کے پیغاموں کو جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہوا؟ قرآن کریم میں جا بجا اُن قوموں کی نشانیاں بھی بیان کی گئی ہیں جنھوں نے اللہ کی نافرمانی کی اور نتیجۃً اللہ نے ان پر اپنا غضب نازل فرمایا اور ان کو دی گئی نعمتیں سلب کر لیں۔

قرآن کریم اس بات کی بھی تکرار کرتا ہے کہ اللہ کی شان یہ نہیں ہے کہ وہ اپنے بندوں پر ظلم کرے اور نہ ہی وہ کسی قوم کو عطا کی ہوئی نعمتیں سلب کرتا ہے سوائے اس کے کہ جب کوئی قوم اللہ کی نافرمانی کی راہ اختیار کرتی ہے، اس کی آیات کو جھٹلاتی ہے، اس کے احکام کی نافرمانی کرتی ہے تو جس طرح آلِ فرعون اور ان کے قبل کے لوگوں کی نعمتیں چھین لی گئیں ان کی نعمتیں بھی سلب کر لی جائیں گی۔

قرآن کریم کی اس طرح کی آیات کی روشنی میں یہ بات دعوے کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اگر کوئی قوم شاہراہِ حیات پر دیگر اقوام سے پچھڑ گئی ہو جس کا قومی اور مذہبی سرمایہ لٹ رہا ہو، جس کی جائدادیں دوسروں کے قبضہ میں چلی گئی ہوں، جس کے افراد میں آپسی میل محبت اور ہمدردی ختم ہو چکی ہو، جو گروہوں

یہ مضمون پیام نو مورخہ ۱۶ر اگست ۱۹۹۱ء کی اشاعت میں شائع ہو چکا ہے۔

اور ٹکڑیوں میں تتر بتر ہو چکے ہوں، وہ قوم یقیناً اُس صراطِ مستقیم سے بھٹک چکی ہے کہ جس کی ہدایت کے لیے رسولِ اکرمؐ مبعوث بہ رسالت ہوئے تھے اور جس راہ پر ان کے مقدس خانوادہ کے پاکیزہ نفوس نے چل کر دکھایا تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ رسول اکرمؐ اور ان کے اہل بیت کا راستہ ہی صراطِ مستقیم ہے۔ مگر کیا ہم اُس صراطِ مستقیم پر خود بھی گامزن ہیں؟ یہ وہ سوال ہے کہ جس پر اگر غور کیا جائے تو ہماری فکری رہنمائی ممکن ہے اور اگر ہم اپنی سمت کو صحیح کرنے کے لیے کوئی شعوری کوشش کریں تو یقیناً بارگاہِ احدیت میں مقبول ہوگی۔ اس کے برخلاف جو لوگ ابھی تک خوابِ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں، جو حالات قومی سے نگاہیں پھیرے ہوئے ہیں اور کوئی عبرت نہیں حاصل کر رہے ہیں اُن کے لیے اللہ کا فرمان ہے:

وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ ۖ لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا ۚ أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ ○

"اور یقیناً ہم نے جنوں اور انسانوں کی بڑی تعداد کو جہنم کے لیے پیدا کیا ہے (ان جہنمیوں کی پہچان یہ ہے کہ) ان کے پاس دل ہیں مگر یہ سمجھتے نہیں (یعنی غور و فکر نہیں کرتے) اُن کے پاس آنکھیں ہیں لیکن یہ ان سے دیکھتے نہیں ہیں (یعنی آیاتِ الٰہی سے عبرت نہیں حاصل کرتے) اور ان کے پاس کان ہیں مگر اُن سے سنتے نہیں (یعنی نصیحتوں کو

ان سنا کر دیتے ہیں) یہ لوگ (انسان نہیں) جانور ہیں بلکہ جانوروں سے زیادہ بھٹکے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ (راہِ ہدایت سے دور) خوابِ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں"۔ (سورہ اعراف آیت ۱۷۹)

ظاہر سی بات ہے کہ جو افراد سورۂ اعراف کی اس آیت کا مصداق ہیں اور جہنم جن کا مقدر ہے وہ نصیحت کو قبول نہیں کریں گے اور نہ ہی اللہ کی نشانیاں ان کی فکر کو بیدار کر سکیں گی۔ مگر ان کے علاوہ جو افراد ہیں جو غور و فکر کی صلاحیتوں کو استعمال کریں گے وہ اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ ہم کو اپنے دین کے بنیادی تصورات پر نظرِ ثانی کی ضرورت ہے۔ ہم کو قرآن کریم کی روشنی میں اپنے اُن نظریات کو پرکھنا ہوگا جن کو ہم نے عقائد و مسلّماتِ دین کا درجہ دے رکھا ہے۔ ہم کو ان افراد کے کردار کو بھی پرکھنا ہوگا جن کو ہم نے عالمِ دین یا ذاکر اور دین کا ٹھیکیدار قرار دے لیا ہے تاکہ علماء کے لبادہ میں ملبوس رہزن اور غدّار ہم کو دھوکہ نہ دے سکیں۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ جو بہت چکنی چپڑی اور لچھے دار باتیں کرتے ہیں، جنھیں عوام کے جذبات سے کھیلنا آتا ہے، جو قسمیں کھا کھا کر اپنی نیک نیتی اور وفاداری کا سکہ بٹھاتے ہیں، مگر قرآن کریم ان کی حقیقت کا پول کھولتے ہوئے آگاہی دیتا ہے:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِىْ قَلْبِهٖ ۙ وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ ۝

"اور لوگوں میں ایسے بھی ہیں جن کی (چکنی چپڑی) باتیں اس دنیوی زندگی میں تمھیں بھلی معلوم پڑتی ہے اور وہ اپنے دل کی باتوں

پر اللہ کو گواہ بناتا جاتا ہے (یعنی اپنے خلوص و محبت کو ثابت کرنے کے لیے بات بات پر قسمیں کھاتا ہے) مگر وہ (حقیقتاً) سب سے بڑا دشمن ہے۔" (سورہ بقرہ آیت ۲۰۴)

آپ کو یاد ہوگا کہ چند برس قبل جب "پیامِ نو" میں اس جھوٹی روایت کی طرف متوجہ کیا گیا تھا کہ جس کے مطابق معاذ اللہ حضرت علی گھوڑے پر بیٹھتے وقت ایک رکاب سے دوسری رکاب کے درمیان قرآن مجید کی تلاوت ختم کر دیتے تھے، تو اس طرح کے بدبخت ذاکرین نے کیا کیا زہر نہیں اُگلا۔ اپنے آپ کو کتنا بڑا محبِ علیؑ اور ہم لوگوں کو دشمنِ اہل بیت اور وہابی ایجنٹ قرار دیا۔ لوگوں کے جذبات کو بھڑکا کر نفرت کی دیواریں کھڑی کرنے کی کوشش کی۔ مگر جب زبانی جمع خرچ سے بات بڑھ کر کتابوں کے حوالوں تک آئی تو ان لوگوں کی پول کھل گئی۔ بجائے کتابیں پیش کرنے کے یہ دلیل دی جانے لگی کہ جب حضرت علیؑ نے خود اپنے کو بائے بسم اللہ کا نقطہ کہا ہے تو پھر قرآن کی تلاوت کیسے پلک جھپکتے میں نہیں کر سکتے۔ مجھ سے ایک صاحب نے یہ بات کہی تو میں نے کہا کہ یہی روایت کتابوں میں دکھا دیجیے کہ حضرت علی نے یہ فرمایا ہے کہ میں "ب کے نیچے کا نقطہ ہوں"۔ پھر میں نے کہا کہ میرے پاس آیۃ اللہ خمینی کی تحریر موجود ہے جس میں انھوں نے اسی ب کے نیچے نقطہ والی روایت کے بارے میں لکھا ہے کہ:

"میں نے یہ روایت کہیں نہیں پڑھی۔ پتہ نہیں یہ روایت کہیں آئی بھی ہے یا نہیں۔ شواہد یہ کہتے ہیں کہ یہ روایت کہیں نہیں آئی۔"

مجھے یہ بات عرض کرتی ہے کہ جب بڑے بڑے علماء و ذاکرین سے بار بار

کی سنی ہوئی یہ باتیں کہ جن کو عقائد کی بنیاد قرار دے لیا گیا ہے کہیں موجود نہیں ہیں تو آپ خود تصوّر کر سکتے ہیں کہ جو لوگ محض سُنی سُنائی باتوں کو قرآن کا درجہ دے بیٹھے ہیں ان کا کیا ہوگا۔جس قوم میں منبروں سے جھوٹ بولا جائے گا اور جھوٹ کو عبادت سمجھ کر سُنا جائے گا وہ قوم یقینی طور پہ تباہ ہو جائے گی یا یہ کہ وہ جھوٹ سے توبہ کر کے حق و صداقت کی راہ پہ آجائے۔

احتجاج

ماہ صفر کا پہلا اتوار شہر لکھنؤ میں اس ظلم کے خلاف بہ طور احتجاج منایا جاتا ہے جس کا ارتکاب سعودی حکمرانوں نے تقریباً پچاس برس قبل کیا تھا۔ یہ ظلم تھا مدینہ منورہ کے مشہور قبرستان جنت البقیع کے روضوں کا منہدم کیا جانا۔ اس قبرستان میں امام حسنؑ، امام زین العابدینؑ، امام محمد باقرؑ، امام جعفر صادقؑ، رسول اکرمؐ کے چچا جناب عباس بن عبد المطلب، حضرت علیؑ کی والدہ جناب فاطمہ بنت اسد، جناب عباس باوفا کی والدہ ام البنین کے علاوہ رسول اکرمؐ کی ازواج اور متعدد اصحاب کی قبور ہیں۔ اس ظلم کے خلاف احتجاجی جلوس علمائے کرام کی قیادت میں نکلا تھا، حالانکہ اس وقت کی انگریز حکومت نے اس کی شدید مخالفت کی تھی۔

اس وقت سے لے کر آج تک زمانے نے کئی کروٹیں بدلیں، ہندوستان آزاد ہو گیا۔ حکومت برطانیہ کا آفتاب غروب ہو گیا۔ مگر قبرستان بقیع کی قبریں آج بھی بغیر سایہ کے ہیں۔ حالیہ برسوں میں صرف اتنی تبدیلی آئی ہے کہ دن میں دو وقت تھوڑی دیر کے لیے زائرین کو قبرستان بقیع میں آنے کی اجازت دے دی جاتی ہے۔ مگر یہ اجازت بھی صرف مردوں کو حاصل ہے، خواتین کو اندر داخلہ

یہ مضمون پیام نو مورخہ ۲۳ اگست ۱۹۹۱ء کی اشاعت میں شائع ہو چکا ہے۔

کی اجازت نہیں ہے۔

دوسری تبدیلی یہ آئی کہ صفر کے پہلے اتوار کا احتجاج ایک سالانہ رسم کی صورت میں آج بھی جاری ہے۔ "رسم" کا لفظ میں نے اس لیے استعمال کیا کہ یہ احتجاج اُن افراد کی فکر سے مربوط نہ ہو سکا کہ جو اس دن سینہ زنی کرتے ہیں ان میں کے بہت سے لوگ یہ جانتے ہی نہیں کہ صفر کے پہلے اتوار کے اس احتجاج کی کیا تاریخ ہے اور جو جانتے ہیں وہ یہ نہیں سوچتے کہ اگر یہاں سے ہزاروں میل دور دوسری حکومت کے غلط عمل کے خلاف ہم احتجاج کر رہے ہیں تو خود سرزمینِ ہند پر ہونے والے مظالم کے خلاف ہم خاموش کیوں ہیں؟ اگر ہندوستان میں کربلاؤں کی زمینیں بک رہی ہیں، اوقاف تباہ ہو رہے ہیں، قبرستانوں پر بلڈوزر اور ہل چل رہے ہیں تو کیا ہماری کوئی ذمہ داری اس سلسلے میں بنتی ہے یا نہیں؟

سعودی حکمراں وہابی مسلک رکھتے ہیں۔ اُن کے نزدیک ہر قبر بُت اور ہر روضہ صنم ہے۔ حتّٰی کہ رسول اکرمؐ کی قبر کے اوپر کا گنبدِ خضریٰ بھی ان کی آنکھوں کو کھٹکتا ہے۔ مگر آج ہمارے یہاں اوقاف کو لوٹنے والے تو وہابی نہیں ہیں، وہ تو "محبانِ اہل بیتؑ" ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں، مجالس و محافل کا انعقاد کرتے ہیں، واہ واہ کرتے اور داد دیتے وقت سب سے زیادہ بلند آواز ان ہی کی ہوتی ہے۔ گریہ بھی ماشاء اللہ خوب کرتے ہیں۔ سعودی حکمرانوں کی طرح سے یہ ہماری پہنچ سے دور نہیں ہیں۔ مگر اس کے باوجود ہم ان سے کوئی باز پرس یا کنارہ کشی نہیں کرتے۔ ہماری بے حسی ان کی دیدہ دلیری میں اضافہ کا باعث ہے۔ ایک طرف زمین کے بڑھتے ہوئے ریٹ (RATE) اور دوسری

طرف ان کا یہ اطمینان کہ قوم کی اکثریت غور و فکر سے کوسوں دور ہے ان کو اس بات پر آمادہ کرتا ہے کہ یہ ایک طرف لاکھوں روپئے کی جائداد بیچ دیں اور دوسری طرف کسی عشرۂ مجالس یا محفل کا انعقاد کر دیں اور اس طرح قوم میں مومن اور دیندار بنے رہیں۔

آپ یاد رکھیں کہ جب تک ہم ظاہری رسم سے اوپر اٹھ کر عقل و فکر کی بنیادوں پر مسائل کو نہیں سمجھیں گے اس وقت تک حالات میں سدھار نہیں آسکتا۔

بزم سوز وسلام

سورہ محمد میں ارشاد رب العزت ہے:

یَآاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰہَ یَنْصُرْکُمْ وَ یُثَبِّتْ اَقْدَامَکُمْ ○

"اے صاحبان ایمان! اگر تم اللہ کی مدد کروگے تو وہ بھی تمھاری مدد کرے گا اور تمھارے اقدام کو ثبات عطا کرے گا۔

کسی بندے کا اللہ کی نصرت کرنے کے معنی ہیں اس کے دین کی سربلندی کے لیے کوشش کرنا، اس کے پیغامات کو عام کرنا، یا اس کے پیغام کے پہنچانے والوں اور دین کی سربلندی کے لیے جد وجہد کرنے والوں کے ساتھ تعاون واشتراک عمل کرنا۔ جو لوگ اس طرح حق نصرت ادا کریں گے تو اللہ بھی ان کی مدد کرے گا اور ان کے اقدام کو ثبات عطا کرے گا۔

کسی بندہ کو اللہ کی نصرت حاصل ہونے کے معنیٰ ہیں اس کی توفیقات میں اضافہ ہونا، ہر طرح کے خوف و حُزن سے آزاد ہونا، ثبات قدمی عطا ہونا، دنیا وآخرت دونوں میں عزت وسرخروئی کا حاصل ہونا اور اس کے مقصد کا بقاء و کامیابی سے ہمکنار ہونا۔

یہ مضمون پیام نو ۳۰/اگست ۱۹۹۱ء کی اشاعت میں شائع ہو چکا ہے۔

آج سے تقریباً ساڑھے تیرہ سو برس قبل کہ جب اسلامی معاشرہ مائل بہ زوال تھا اور امتِ مسلمہ بے سمتی اور فکری پراگندگی کا شکار تھی، امام حسینؑ نے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی بنیادوں پر اصلاح معاشرہ کے لیے قیام فرمایا۔ ان کی اس مہم میں ان کے چند رفقاء اور عزیزوں نے ان کے ساتھ اپنی جانیں قربان کیں کہ جن کی مجموعی تعداد ایک سو بتائی جاتی ہے، ہزاروں کے لشکر کے مقابلہ میں اس قلیل تعداد کا ثابت قدم رہنا اور سکون و اطمینان کے ساتھ شہادت سے ہم کنار ہونا ایک ایسا واقعہ ہے کہ جو یُثَبِّتْ اَقْدَامَکُمْ کی عملی تفسیر ہے۔

وہ لوگ کہ جن کے اسباب حیات کو منقطع کر دیا گیا اور دشمن نے اپنے خیال خام میں جن کو ہر طرح سے ذلیل کرنے میں کوئی کسر نہیں باقی رکھی تھی یعنی جسموں کو مُثلہ کیا، سروں کو کاٹا اور خیموں کو لوٹا، بیبیوں کی چادریں تک چھین لیں۔ ان ہی کے لیے وعدۂ الٰہی یوں پورا ہوا کہ آج ظالم خود ذلیل و رسوا ہے اور وہ مظلوم افراد تاریخ عالم میں عزت و سربلندی کی روشن مثال ہیں۔

امام حسینؑ کی سیرت آج بھی ظلم کے خلاف صف آرا ہونے والوں اور تبلیغ دین کی راہ میں صعوبتیں برداشت کرنے والوں کے لیے منارۂ ہدایت ہے۔

وہ زینبؑ کہ ہنگام عصر میں جن کے سر سے چادر چھین لی گئی آج دمشق میں ان کے روضہ کا یہ عالم ہے کہ چار سال اور پانچ سال کی بچیاں بھی بغیر حجاب کے وہاں حاضر نہیں ہوتی ہیں اور باوجودیکہ بھرا کنبہ لٹ چکا تھا اور خود اسیری کے عالم میں تھیں مگر شہیدوں کے پیغام کو اس طرح پہنچایا کہ آج پوری دنیا میں

کربلا والوں کا ذکر جاری و ساری ہے۔

آج کربلا والوں کا ذکر زمان و مکان اور عقیدہ و مسلک کی قید سے آزاد ہے۔ ہر صاحب دل اس المیہ کی کسک محسوس کرتا ہے اور اپنی صلاحیت کے مطابق احساسات کا اظہار کرتا ہے۔ سرزمین ہند اور بالخصوص اودھ کی گنگا جمنی تہذیب نے یادِ کربلا کو مختلف انداز سے پیش کیا۔ ان ہی میں سے ایک "سوز خوانی" ہے۔ مجالس، مراثی اور نوحوں کا چلن دیگر ممالک میں بھی ہے لیکن "سوز" خالص ہندوستانی دین ہے، جس میں سوز خواں آواز کے اُتار چڑھاؤ سے اشعار کو مخصوص سوز و گداز عطا کرتا ہے۔ کہتے ہیں کہ "سوز" کی ایجاد کرنے والے تان سین ہیں جنھوں نے شاستری سنگیت کے اصولوں پر سب سے پہلے رِثائی اشعار پڑھے۔ فن سوز خوانی اودھ میں پروان چڑھا عبدالحلیم شرر کے مطابق سوز خوانی نے تعزیہ داری کو کافی فروغ دیا۔

علماء کی جانب سے سوز خوانی کی مخالفت بھی ہوئی۔ غالباً اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ سوز خوانی ایران، عراق یا عرب سے نہیں آئی اور دوسرے یہ کہ آواز کا اتار چڑھاؤ شاستری راگوں کا پابند تھا۔ ایک اور وجہ اس کی یہ ہو سکتی ہے کہ اوّلین سوز خوانوں میں پیشہ ور گانے والے ہوا کرتے تھے جو محرم میں گانا نہ گا کر سوز خوانی کے ذریعہ ریاض کیا کرتے تھے۔ بہر حال اس مخالفت کے باوجود سوز خوانی کو قبولِ عام حاصل ہوا۔ نوابین و امرار نے اس کی قدر دانی کی اور سرپرستی فرمائی۔ مگر اودھ کی شاہی کے خاتمہ کے ساتھ اور بہت سے فنون کی طرح فنِ سوز خوانی پر بھی زوال آیا۔ لکھنؤ میں اس کا چلن تقریباً متروک

ہوگیا مگر دیگر بستیوں اور آبادیوں میں آج بھی اس کا رواج قائم ہے۔ ایک اچھی بات یہ ہوئی کہ سوز خوانی کی مخالفت بھی ختم ہوگئی کیونکہ ایک جانب یہ پیشہ ور ہاتھوں سے آزاد ہوئی اور دوسری طرف بہر حال یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ سوز خوانی غم والم کے جذبات ہی پیدا کرتی ہے اور بعض علماء کے نزدیک وہی موسیقی اور گانا شرعاً حرام ہے جو جنسی جذبات اور نفسانی خواہشات کو بڑھاوا دے۔

فن سوز خوانی کے احیاء کے لیے علی کانگریس کی جانب سے گذشتہ سال "بزم سوز و سلام" کا انعقاد کیا گیا تھا تاکہ لوگوں کی توجہ مبذول کرائی جاسکے۔ بحمداللہ یہ کوشش بارآور ہوئی اور کئی جگہ جہاں پہلے سوز خوانی نہیں ہوتی تھی اس کا سلسلہ شروع ہوا۔ آج "بزم سوز و سلام" کی دوسری نشست ہے۔ اس نشست کو میر انیس مرحوم کی یاد سے منسوب کیا گیا ہے۔ سوز خوانی میں آواز کے ساتھ کلام کی بھی اہمیت ہوتی ہے۔ میر انیس کا کلام فصاحت میں اپنا جواب نہیں رکھتا ہے۔ انھوں نے واقعۂ کربلا کو اس انداز سے نظم کیا کہ اردو شاعری میں مرثیہ کو ایک الگ صنف کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ آج تقریباً ایک صدی گذر جانے کے باوجود ان کے سلام و مرثیے زبان زد خاص و عام ہیں۔ فن سوز خوانی کا ارتقا اس بات کا متقاضی ہے کہ ہمارے شعراء ان ہی کا ایسا فصیح کلام نظم کریں جو آسانی کے ساتھ سوز کے قالب میں ڈھل سکے۔

ہماری تنظیم علی کانگریس اس بات پر یقین رکھتی ہے کہ یاد کربلا دین کی تقویت و سربلندی کا ذریعہ ہے جس طرح دین کو کسی چہار دیواری میں قید نہیں کیا جاسکتا۔ اسی طرح یاد کربلا کو بھی امام باڑوں اور کربلاؤں میں محدود

کر دینا یا کسی ایک فرقہ یا مسلک سے وابستہ کر دینا کربلا والوں سے نا انصافی ہوگی ہمارے بزرگوں کی یہی سیرت رہی ہے۔ ذکر حسینؑ مسجد میں بھی ممکن تھا، مگر امامباڑوں کی تعمیر اس لیے کی گئی تاکہ غیر مذہب کے افراد بھی بغیر تکلف کے آسکیں۔ مگر ہماری اپنی کوتاہیوں سے تکلفات کے پردے حائل ہو گئے اور آج کسی ایسے اجتماع کے لیے کہ جس میں مختلف نظریات کے افراد کو مدعو کیا جا سکے امام باڑوں کی افادیت مشکوک ہو گئی ہے۔ مختلف پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد ممبران علی کانگریس نے "بزم سوز و سلام" کے لیے ہوٹل کلارکس اودھ کو منتخب کیا اور بحمد اللہ یہ انتخاب صحیح ثابت ہوا۔

آج عزاداری کے دائرہ میں وسعت لانے کی ضرورت ہے اور اس کے لیے لازم ہے کہ ہم عزاداری سے وابستہ فنون کا تحفظ کریں۔ خاص طور پر فن سوز خوانی کے بارے میں ہم تمام عزاداران امام سے گذارش کرتے ہیں کہ وہ جب مجالس کا انعقاد کریں تو سوز خوانی کا بھی اہتمام کریں اور دوسری گذارش یہ ہے کہ آپ مجالس کا انعقاد کرتے وقت اپنی جان پہچان کے دیگر مسالک و مذاہب کے افراد کو بھی ضرور مدعو کریں۔ انشاء اللہ آپ کی یہ کوشش نصرتِ دین شمار ہوگی۔

(یہ مقالہ ۲۵ر اگست ۱۹۹۱ء کو ہوٹل کلارکس اودھ میں منعقدہ بزم سوز و سلام میں پیش کیا گیا۔)

دین میں جھوٹ

جھوٹ بولنا گناہان کبیرہ میں سے ہے۔ ارشاد معصوم ہے کہ ایمان اور جھوٹ یکجا نہیں ہو سکتے۔ جھوٹ کی مذمت میں متعدد آیات قرآنی اور احادیث موجود ہیں۔

جھوٹ کی بدترین قسم وہ ہے کہ جس میں اللہ اور رسولؐ پر جھوٹ باندھا جاتا ہے اور یہ وہ جھوٹ ہے کہ جو روزہ کو باطل کر دیتا ہے۔

بہت سے ایسے جھوٹ ہیں کہ جن میں ہم لوگ بغیر سوچے سمجھے مبتلا ہو جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر کسی شخص سے کھانے کو کہا جائے اور وہ بغیر کسی عذر شرعی کے یہ کہہ دے کہ میں کھانا کھا کر آیا ہوں یا یہ کہ مجھے بھوک نہیں لگی ہے حالانکہ وہ اس وقت بھوکا ہو تو اس کا ایسا کہنا بھی جھوٹ شمار ہوگا۔

قرآن کریم کی متعدد آیات میں جھوٹوں پر لعنت بھیجی گئی ہے۔ اور یہ جھوٹ وہ برائی ہے کہ جس کو ہم ان تمام قوموں میں مشترک پاتے ہیں کہ جن پر عذاب الٰہی نازل ہوا۔

جس طرح مردار کھانا حرام ہے مگر بعض حالات میں مباح ہو جاتا ہے اسی طرح جھوٹ حرام ہے مگر بعض مخصوص حالات میں جھوٹ بولا جا سکتا ہے۔

۱۔ دفعِ فساد کے لیے۔ مثلاً کسی مومن کی جان بچانا یا امانت کی حفاظت۔

یہ مضمون پیام نو مورخہ ۶ر ستمبر ۱۹۹۱ء کی اشاعت میں شائع ہو چکا ہے۔

۲۔ اصلاح کے لیے (مثلاً بچہ کو ڈرانے یا نیک کام کا شوق دلانے کے لیے۔)
۳۔ جہاد و دفاع اسلام میں دشمن سے جھوٹ بولنا اور رازوں کو پوشیدہ رکھنا
۴۔ جب شوہر بیوی سے مجبوراً کوئی ایسی بات کا وعدہ کرلے جس پر قدرت نہ رکھتا ہو، یا قدرت رکھتا ہو لیکن وہ اس پر واجب نہ ہو، یا یہ کہ اس کے کئی بیویاں ہوں اور وہ ہر ایک سے کہے مجھے تجھ سے زیادہ محبت ہے جبکہ حقیقتاً ایسا نہ ہو۔

ان مخصوص حالات میں جھوٹ بولنے کی اجازت محض اس لیے ہے کہ اگر انسان دو بلاؤں میں مبتلا ہو جائے تو آسان اور ہلکی مصیبت کو ترجیح دے کر اختیار کرلیتا ہے۔ اس کے لیے لازم ہے کہ انسان ضروری اور غیر ضروری میں تمیز کرسکتا ہو۔ اور اگر خدا نخواستہ کسی شخص کو اس طرح جھوٹ بولنا پڑے تب بھی اس کو چاہیے کہ وہ اللہ سے ڈرتا رہے اور توبہ کرے۔

جھوٹ کی بدترین قسم وہ ہے کہ جب اسے دین میں داخل کر دیا جائے، یعنی جب اللہ اور اس کے رسولؐ سے جھوٹی باتیں منسوب کی جائیں، جھوٹی روایتیں بیان کی جائیں اور اس طرح دین کی شکل بگاڑ دی جائے۔ جھوٹ پر مبنی معاشرہ کی تباہی یقینی ہے کیونکہ جو لوگ اللہ اور رسول سے خیانت کریں گے تو وہ آپس میں کب امانت داری برتیں گے؟ نتیجۃً ایک دوسرے پر سے اعتبار اُٹھ جائے گا اخوت و بھائی چارگی کے بجائے بغض و حسد اور ہمدردی کے بجائے نفاق کا دور دورہ ہوگا، رشتے ٹوٹ جائیں گے اور اجتماعی زندگی منتشر ہو جائے گی دشمن ان پر جری ہو جائے گا اور یہ بے دست و پا ہو جائیں گے اور ان کی

ساری عزت خاک میں مل جائے گی۔

جس طرح نالی کا کیڑا نالی ہی میں مگن رہتا ہے اور اگر اس کو نالی سے نکال کر مخملی قالین پر ڈال دیجیے تو اس کا جینا دشوار ہو جائے گا۔ اسی طرح جھوٹ کا خوگر انسان حق کی فضا میں دم توڑنے لگتا ہے جب کوئی حق بات اس کے سامنے پیش ہوتی ہے تو بجائے اس کے کہ حق کو خندہ پیشانی کے ساتھ قبول کرے، اللہ کا شکر ادا کرے کہ حق اس کے سامنے واضح اور روشن ہو گیا وہ حق سے ڈرنے لگتا ہے، اسے حق سے کراہت محسوس ہوتی ہے، بجائے شکر گزاری کے وہ اُلٹے الزام تراشی کرتا ہے، کہتا ہے کہ یہ بیان کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ کیوں کہہ دیا، وہ کیوں لکھ دیا؟ اتنے بڑے بڑے علماء و خطباء گذر گئے انھوں نے کبھی کچھ نہ کہا۔ آپ بھی خاموش رہیے۔

جب دین میں جھوٹ بولا جاتا ہے تو وہ بڑھتا جاتا ہے۔ جھوٹ پر جھوٹ کے ردّے رکھتے رکھتے جھوٹ کی پوری ایک عمارت تعمیر ہو جاتی ہے کہ جو دین و دنیا دونوں کو تباہ کر دیتی ہے۔

میرے ایک جاننے والے عالم و ذاکر نے بیان کیا کہ وہ عشرۂ محرّم میں جہاں مجلس پڑھ رہے تھے وہاں تین اور ذاکرین بھی مجلس پڑھ رہے تھے۔ ایک مجلس صبح ہوتی تھی، ایک دوپہر میں، ایک سہ پہر کو اور چوتھی مجلس جو شب میں ہوتی تھی، اس کو یہ خطاب کرتے تھے۔ مجالس میں مشترک مجمع ہوتا تھا۔ انھوں نے بتایا کہ ساتویں محرّم کو شام کے وقت وہاں کے چند مومنین ان کے پاس آئے اور کہا کہ صبح کے ذاکر نے شہادت قاسم بیان کرتے وقت

پڑھا کہ جناب قاسم کا لاشہ پامال ہونے کے سبب اتنا لمبا ہو گیا تھا کہ جب امام حسینؑ لاش لے کر چلے تو سینے سے سینہ ملا لیا تھا مگر زمین پر پیر خط دیتے جاتے تھے۔ دوپہر کی مجلس کے ذاکر نے پڑھا کہ لاش کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے تھے، اور امام حسینؑ عبا کے دامن میں ٹکڑوں کو باندھ کر لائے تھے۔ سہ پہر والے ذاکر نے پڑھا کہ لاش ٹکڑے ٹکڑے نہیں، بلکہ ریزہ ریزہ ہو گئی تھی اور خاک میں یہ ذرّات مل گئے تھے۔ امام حسینؑ جب میدان میں آئے اور جناب قاسم کو آواز دی تو کوئی جواب نہیں آیا۔ پھر امام حسینؑ ایک بلندی پر کھڑے ہوئے اور کہا کہ "قاسم! تمھارا امام تم کو آواز دے رہا ہے، آؤ۔" تو جناب قاسم کے جسم کے ریزے خاک سے نکل کر باہر آئے اور ان ریزوں سے لاش تیار ہو گئی جس کو لے کر امامؑ آئے۔

ان لوگوں نے کہا کہ ہم لوگ پڑھے لکھے نہیں ہیں مگر اتنا سمجھتے ہیں کہ جناب قاسم کا واقعہ تو ایک ہی طرح ہوا ہوگا۔ یہ لوگ الگ الگ کیسے بیان کر رہے ہیں؟ دوسرے مسلک کے لوگوں کے سامنے ہمیں بہت شرمندگی ہوتی ہے کہ اس میں سچ کیا ہے۔ ان ذاکر صاحب نے کہا کہ وہ لوگ کہاں سے بیان کر رہے ہیں یہ ان ہی سے پوچھیے مگر میں نے جو مستند کتابوں میں پڑھا ہے وہی بیان کروں گا۔

جو شخص بھی قرآنِ کریم کا مطالعہ کرے گا اس کے سامنے یہ بات واضح اور روشن ہو جائے گی کہ گمراہی کا اصل سبب عقل کو استعمال نہ کرنا ہے۔ جب لوگ عقل کو استعمال نہیں کرتے، غور و فکر سے کام نہیں لیتے تو گمراہی ان کا مقدّر بن جاتی ہے۔ لہٰذا اصلاحِ معاشرہ کی تدابیر میں اوّلیت لوگوں کو دعوتِ فکر دینے کو حاصل ہونا چاہیے۔

مثال کے طور پر اگر کوئی گاڑی غلط سمت میں جا رہی ہے تو جب تک اس کی سمت صحیح نہیں کی جائے گی وہ منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ پائے گی۔ اسی اصول کی بنیاد پر "تحریک دین فہمی" قائم ہے۔ دین فہمی کا مقصد لوگوں کو عقل و فہم کی بنیاد پر دین کو اخذ کرنے اور اس پر عمل کرنے کی دعوت دینا ہے۔

دین کے معاملات میں عقل کے استعمال کی راہ میں سب سے بڑا روڑا "تقلید" کا موجودہ نظریہ ہے کہ جس کے بارے میں ہم اپنا موقف واضح کر چکے ہیں (ملاحظہ فرمائیں "دین کا بنیادی تصور تقلید اور اتباع" از: الحاج مرزا جاوید مرتضیٰ) دوسرا بڑا روڑا وہ سُنی سنائی روایتیں ہیں کہ جو ہم کو فکرِ آخرت سے بے پروا کرتی ہیں اور عامۃ النّاس کو یہ باور کراتی ہیں کہ علم دشمنی اور بے عملی کے ساتھ

یہ مضمون پیامِ نو مورخہ ۲۰ ستمبر ۱۹۹۱ء کی اشاعت میں شائع ہو چکا ہے۔

بھی جنّت میں پہنچنا ممکن ہے۔ اس ضمن میں ایک واقعہ پیش ہے:

جون ۱۹۸۹ء میں میرا بمبئی جانا ہوا۔ وہاں ایک عالم دین نے دورانِ گفتگو بتایا کہ مولانا محمود الحسن نجفی صاحب (جو ناصریہ عربک کالج، جون پور کے پرنسپل ہیں) نے آپ کی مخالفت میں یہاں مجلسیں پڑھیں اور کہا کہ جاوید مرتضیٰ لوگوں کے عقیدے خراب کر رہا ہے، لوگوں کو گمراہ کر رہا ہے۔

اس پر میں نے پوچھا کہ کیا بمبئی میں کسی نے مولانا محمود الحسن نجفی صاحب سے یہ نہیں کہا کہ سرکار! جب لکھنؤ میں دین پر یہ آفت آئی ہوئی ہے تو آپ وہیں لکھنؤ میں رُک جاتے، جاوید مرتضیٰ کو سمجھاتے ورنہ اس کی تحریروں کا جواب وہیں تحریر سے دیتے، یہاں تو ہم کسی سے بھی مجلس پڑھوا لیتے۔

اُن مولانا صاحب نے کہا کہ ایسا تو اُن سے کسی نے نہیں کہا۔ پھر انھوں نے فرمایا کہ مولانا محمود الحسن نجفی صاحب نے یہ بھی کہا کہ جاوید مرتضیٰ نے یہ لکھا ہے کہ جناب سیّدہ صفِ عزا پر نہیں آتی ہیں۔ اس پر میں نے کہا کہ جہاں تک لکھنے کا سوال ہے تو یہ بات میں نے نہیں بلکہ ایران کے مشہور شیعہ عالم دین آیۃ اللہ مرتضیٰ مطہری شہید نے لکھی ہے کہ جناب سیّدہ صفِ عزا پر نہیں آتی ہیں۔ لیکن جہاں تک عقیدہ کا سوال ہے تو میں بھی اس بات کو مانتا ہوں کہ جناب سیّدہ فرشِ عزا پر تشریف نہیں لاتی ہیں۔

میری اس بات پر ان عالم دین کو بہت تعجب ہوا اور انھوں نے حیرت سے پوچھا کہ کیا واقعی آپ اس کے قائل نہیں ہیں؟ تو میں نے ان سے کہا

کہ اس موضوع پر میں آپ سے گفتگو کرنے پر تیار ہوں۔

چنانچہ اگلے دن نمازِ فجر کا وقت اس موضوع پر گفتگو کے لیے طے پایا۔

جب بات شروع ہوئی تو میں نے ان سے کہا کہ آپ صاحب عمامہ ہیں، آپ نے نجف میں تعلیم حاصل کی ہے۔ آپ کا اندازِ فکر عام افراد سے جدا ہونا چاہیے۔ آپ کو قرآن اور عقل کی روشنی میں روایات پر غور کرنا چاہیے۔

میں نے ان سے عرض کیا کہ قرآن کریم میں قبض روح کے لیے لفظ "توفّٰی" اور اس کے مشتقات کا استعمال کیا گیا ہے جس کے معنیٰ ہیں "پورا پورا وصول کرنا" (خود ہمارے یہاں اردو زبان میں بولتے ہیں "وعدہ وفا کرنا" یعنی وعدہ پورا کرنا، اسی سے لفظ "وفات" بنا ہے) اور اس قبض روح کی نسبت یا تو اللہ نے خود اپنے سے دی ہے یا ملک الموت سے اس کی نسبت دی ہے۔

مثلاً سورہ حٰمٓ سجدہ کی ۱۱ویں آیت میں ملک الموت سے قبضِ روح کی نسبت دیتے ہوئے ارشاد ہوا:

قُلْ يَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِيْ وُكِّلَ بِكُمْ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ ۝

"کہہ دو کہ ملک الموت تمھارے اوپر تعینات ہے وہی تمھاری روحیں قبض کرے گا، اس کے بعد تم سب کے سب اپنے پروردگار کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔"

اسی طرح سورۂ زمر میں روحوں کے قبض کرنے کو اپنی طرف نسبت دیتے ہوئے ارشادِ الٰہی ہے۔

اَللّٰہُ یَتَوَفَّی الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِھَا وَالَّتِیْ لَمْ تَمُتْ فِیْ مَنَامِھَا ج فَیُمْسِکُ الَّتِیْ قَضٰی عَلَیْھَا الْمَوْتَ وَیُرْسِلُ الْاُخْرٰی اِلٰٓی اَجَلٍ مُّسَمًّی ط اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ

"اللہ ہی موت کے وقت لوگوں کی روحیں اپنے قبضے میں کرلیتا ہے اور جو ابھی نہیں مرے انھیں نیند میں (اپنے قبضے میں کرلیتا ہے) بس جن (سونے والوں) کی موت کا حکم دے دیتا ہے ان کی روحیں روک لیتا ہے اور باقی کی روحیں ایک مقررہ وقت تک کے واسطے بھیج دیتا ہے۔ بے شک صاحبان فکر کے لیے اس میں (اللہ کی) نشانیاں ہیں۔" (سورہ زمر آیت ۴۲)

قبض روح کے عمل کو اللہ کا اپنی طرف یا ملک الموت کی طرف منسوب کرنا اس حقیقت کو ثابت کرتا ہے کہ نفس یا روح کو پوری طرح قبضے میں لے لیا جاتا ہے اور روح کے کھونے یا بھٹکنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ (ملاحظہ فرمائیں:۔ تفسیر المیزان از علامہ محمد حسین طباطبائی۔ انگریزی ترجمہ جلد دوم صفحہ ۲۰۲)

تفسیر نمونہ میں سورہ آل عمران کی ۱۶۹ ویں و ۱۷۰ ویں آیات کے ذیل میں رسول اکرمؐ کی یہ حدیث درج کی گئی ہے:

"خدا نے شہدائے احد کی ارواح کو خطاب کرتے ہوئے ان سے پوچھا کہ تمھاری کیا آرزو ہے تو انھوں نے کہا: پروردگار ہم اس سے زیادہ کیا آرزو کرسکتے ہیں کہ ہم ہمیشہ کی نعمتوں میں مستغرق ہیں اور تیرے عرش کے سائے میں رہتے ہیں، ہمارا تقاضہ صرف یہ ہے کہ ہم

دوبارہ دنیا کی طرف پلٹ جائیں اور پھر سے تیری راہ میں شہید ہوں۔
اس پر خدا نے فرمایا: میرا اٹل فیصلہ ہے کہ کوئی شخص دوبارہ دنیا کی طرف نہیں پلٹے گا۔ انھوں نے عرض کیا: جب ایسا ہی ہے تو ہماری تمنا ہے کہ ہمارا سلام پیغمبر اسلام کو پہنچادے، ہمارے حالات ہمارے پسماندگان کو بتادے اور انھیں ہماری حالت کی بشارت دے تاکہ انھیں کسی قسم کی پریشانی نہ ہو۔ اس وقت یہ آیات نازل ہوئیں۔

پھر میں نے ان سے کہا کہ اب میں آپ کو عقلی دلیل دیے دیتا ہوں۔ آپ یہاں سے سڑک پر تشریف لے جائیے اور ہر آنے جانے والے سے کہیے کہ میں تمھارے سامنے دو ماؤں کا کردار پیش کر رہا ہوں۔ ایک ماں وہ ہے کہ جب اس کا بیٹا قتل کیا جاتا ہے اور قاتل اس کے بیٹے کا سر اس کی طرف پھینکتے ہیں تو وہ ماں اپنے بیٹے کا سر واپس میدان کی طرف پھینک دیتی ہے اور کہتی ہے کہ ہم جو چیز راہِ خدا میں دے دیتے ہیں واپس نہیں لیتے۔ اور دوسری ماں وہ ہے کہ جو آج بھی گلی گلی اور گھر گھر جا کر چاہتی ہے کہ لوگ اُسے اس کے بیٹے کا پرسہ دیں۔ تم بتاؤ کہ ان دونوں ماؤں میں سے کس کا کردار افضل ہے۔

اُن عالمِ دین نے بے ساختہ فرمایا کہ آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔

میں نے ان سے کہا کہ اس طرح کی بے سروپا باتیں جناب فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا سے منسوب کرنا نادانی ہے۔ ان کے لیے ہر شخص محرم نہیں ہے اگر بالفرض وہ آج بہ نفسِ نفیس موجود بھی ہوتیں تب بھی وہ ہر کس و ناکس کی آنکھ سے آنسو نہیں پونچھ سکتی تھیں۔ اگر تمام سادات کو ان کا محرم تصور

کر لیجیے تب بھی غیر سادات تو ان کے لیے نامحرم ہوئے ہی۔

اس طرح کی باتیں غالباً بچوں کو صفِ عزا کے آداب سکھانے کے لیے کہی گئیں۔ مگر لوگوں نے آدابِ صفِ عزا تو سیکھے نہیں اُلٹے اور بے راہ روی اختیار کرلی۔ سچ ہے حق کی تبلیغ جھوٹ کے ساتھ نہیں ہو سکتی۔

اس کے بعد ان عالم دین نے سوال کیا کہ آپ ان روایات کے بارے میں کیا کہتے ہیں جن کے مطابق موت کے وقت یا قبر میں حضرت علیؑ کی زیارت ہوتی ہے۔ (جواب کے لیے اگلا مضمون ملاحظہ فرمائیں۔)

(یہاں یہ عرض کرنا مناسب ہوگا کہ مولانا محمود الحسن نجفی صاحب سے نہ تو اس موضوع پر کوئی گفتگو ہوئی تھی اور نہ ہی کوئی تحریر ان کو بھیجی تھی، بغیر کسی قسم کی تحقیق کیے یا حجت کو تمام کیے بغیر میرے خلاف مجلسیں پڑھنا ایک ایسا جھوٹ ہے کہ جس میں غیبت بھی شامل ہے۔ جس قوم کے علماء جھوٹ بولنے میں کوئی عار نہیں محسوس کریں گے اور عوام اس جھوٹ کو عبادت کی طرح سنیں گے تو اس قوم کی تباہی یقینی ہے۔ الا یہ کہ اپنی غلط روش سے توبہ کرکے راہِ مستقیم پر آجائے۔)

جنابِ سیّدہؑ کی آمد

ایک مُراسلہ اور اس کا جواب

گذشتہ مضمون کے ضمن میں ہمیں ایک بہت اچھا مراسلہ ایک برادر مومن جناب اقبال حسین صاحب ساکن ۲۲/۷ منصور نگر، لکھنؤ کا موصول ہوا ہے جو قارئین پیامِ نو کی خدمت میں پیش ہے۔ جناب اقبال حسین صاحب لکھتے ہیں

جناب ایڈیٹر صاحب، پیامِ نو ــــ سلامٌ علیکم

پیام نو مورخہ ۲۰ر ستمبر ۱۹۹۱ء میں "دعوتِ فکر" کے عنوان کے تحت آپ نے لکھا کہ جناب سیدہ فرشِ عزا پر نہیں آتی ہیں اور اس ذیل میں آیتوں کے علاوہ جو حدیث آپ نے بیان کی ہے کہ "اس پر خدا نے فرمایا میرا اٹل فیصلہ ہے کہ کوئی شخص دوبارہ دنیا کی طرف نہیں پلٹے گا"۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ نے یہاں پر "کوئی شخص" میں ائمہ طاہرینؑ کو بھی شامل کر لیا ہے۔ یعنی رسول کو اپنا ہی جیسا بشر مان لیا جبکہ رسولؐ کی حدیث ہے اللہ نے سب سے پہلے میرا نور خلق کیا پھر اس کے حصے ہوتے ہوتے چودہ معصوم ہوئے۔

یہ مضمون پیام نو مورخہ ۲۷ر ستمبر ۱۹۹۱ء کی اشاعت میں شائع ہو چکا ہے۔

دوسری بات یہ کہ جو شے فنا ہو چکی ہے وہ دنیا میں دوبارہ واپس نہیں آسکتی جبکہ شہید فنا نہیں ہوتے اور حدیث کسا کہتی ہے کہ خدا نے یہ دنیا پنجتنِ پاک کے واسطے ہی خلق کی ہے، تو کیا خدا ان ہی کو دنیا سے ہٹا لے گا اور واپس نہیں آنے دے گا؟

آپ نے دوسری دلیل اس طرح بیان کی ہے کہ "ماں نے بیٹے کے سر کو یہ کہتے ہوئے واپس کر دیا کہ ہم جو چیز راہِ خدا میں دے دیتے ہیں اُسے واپس نہیں لیتے۔"

یہاں پر قابلِ غور بات یہ ہے کہ ماں نے بیٹے کا سر واپس لینے سے انکار کیا نہ کہ اپنے بیٹے کا پُرسہ لینے سے بھی انکار کر دیا۔

اس کے علاوہ بھی بہت سی احادیث یا واقعات ہیں جن سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ائمہ طاہرین خود یا جنھیں وہ چاہیں دوبارہ دنیا میں آسکتے ہیں۔

۱۔ حضرت عیسیٰؑ اور حضرت علیؑ کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ وہ مُردوں کو زندہ کیا کرتے تھے تو کیا یہ ممکن نہیں کہ وہ خود دوبارہ دنیا میں واپس آسکیں۔

۲۔ حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ہمارے امامِ زمانہؑ کے پیچھے نماز ادا کریں گے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ جو دنیا سے جا چکا ہو واپس آکر نماز پڑھے گا۔

۳۔ شامِ غریباں کی مشہور روایت ہے کہ حضرت زینب نے سامنے سے ایک سوار کو آتے دیکھا تو وہ کہنے لگیں۔ ٹھہر جا، پیاسے بچے ابھی ابھی

تھک کر سوئے ہیں۔ سوار کے نہ رکنے پر جناب زینبؑ کو غیض آگیا اور کہنے لگیں۔ علیؑ کی بیٹی تجھ سے کہہ رہی ہے اور تو رکتا نہیں، تب ہی سوار نے چہرے سے نقاب ہٹا کر کہا۔ بیٹی تم نے مجھے پہچانا نہیں میں تمھارا بابا علی مرتضیٰ ہوں۔ تو یہ کیسے ممکن ہوا کہ حضرت علیؑ دنیا سے جانے کے بعد کربلا آگئے۔

۴۔ واقعات کربلا کے ذیل میں بیان ہوتا ہے۔ کسی خیمے کے پیچھے سے کسی بی بی کے رونے کی درد بھری آواز آرہی تھی۔ جناب زینبؑ نے امام حسینؑ سے اس کے بارے میں سوال کیا تو امام نے فرمایا: "یہ ہماری دکھیاری ماں فاطمہ زہرا ہیں۔ تم نے انھیں پہچانا نہیں"؟ تو یہ کیسے ممکن ہے کہ شہزادی فاطمہ دنیا سے جانے کے بعد کربلا میں آجائیں، اگر ممکن ہے تو کیا وہ صفِ عزا پر نہیں آسکتیں؟

۵۔ آپ کی خود کی لکھی کتاب "سفر آخرت" کے صفحہ ۳۲۔ ۳۳ پر درج واقعہ میں بجائے روح کے خود مردہ قبر سے نکل آتا ہے اور گریبان پکڑ کر اپنی بات کہتا ہے جبکہ قابل غور بات یہ ہے کہ مردہ نیک اعمال بھی نہیں تھا تو کیا یہ ممکن ہے کہ ایک بد اعمال مردہ قبر سے واپس آسکتا ہے لیکن ایک معصومہ فرشِ عزا پر نہیں آسکتیں

میں پیامِ نو بڑی دل چسپی سے پڑھتا ہوں کیونکہ اس میں ہمارے معاشرہ میں پیدا برائیوں اور غلط فہمیوں کی طرف دھیان دلایا جاتا ہے اور اسے دور کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ لیکن میں پیامِ نو کے اس شمارہ سے قطعی مطمئن

نہیں ہوں۔ کیونکہ یہ بات خلاف عقیدہ اور عقل ہے اس لیے میں چاہتا ہوں کہ آپ ایک بار پھر میرے ان سوالوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے یہ بتائیں کہ جناب سیدہ سلام اللہ علیہا فرش عزا پر آسکتی ہیں یا نہیں؟

والسلام

اقبال حسین ۲۲۷۔ منصور نگر، لکھنؤ

ہم جناب اقبال حسین صاحب کی قدر کرتے ہیں کہ انھوں نے "دعوت فکر" پر لبیک کہی اور اس مسئلہ پر غور کیا۔ یہی تحریک دین فہمی کی کامیابی ہے۔

اب غور کرتے وقت ہم کس چیز کو بنیاد یا کسوٹی بنائیں گے؟ محض سُنی سُنائی باتیں جن کا وجود کتابوں میں نہیں ملتا؟ یا یہ کہ ہم اوّلیت قرآن کریم کے بیان کو دیں گے؟

اگر آپ گذشتہ شمارہ کو دوبارہ پڑھیں تو آپ پر یہ بات واضح ہو جائے گی کہ میں نے اصل بحث "قبض روح" کے موضوع پر آیات قرآنی کی بنیاد پر کی ہے۔

رسول اکرمؐ کی خلقت بشر کی طرح تھی یا وہ فرشتوں کی طرح نوری مخلوق تھے، اس کو آپ برائے مہربانی قرآن کریم کی روشنی میں معلوم کریں۔ آپ اس مضمون پر آیات قرآنی کی تفصیلات کسی بھی عالم دین سے دریافت کر سکتے ہیں۔

حیات شہدا کے بارے میں غور کرتے وقت كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْت اور كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ کو بھی پیش نظر رکھیں۔ ساتھ ہی یہ بھی پیش نظر رکھیں کہ شہید کی بیوی بیوہ کہلاتی ہے اور اس کا بھی عقد ثانی ہو سکتا ہے۔ شہید کے بچے یتیم کہلاتے ہیں اور اس کی میراث تقسیم ہوتی ہے۔

جناب جعفر طیار کی جنگ موتہ میں شہادت کے بعد ان کی زوجہ حضرت اسماء بنت عمیس کا عقد حضرت ابوبکر سے ہوا تھا (جناب محمد بن ابی بکر حضرت اسماء کے بطن سے تھے) اور حضرت ابوبکر کے انتقال کے بعد حضرت علیؑ نے حضرت اسماء سے شادی کی تھی۔

رسول اکرمؐ کا حضرت خدیجہ کی زندگی میں کسی اور عورت سے شادی نہ کرنا اور حضرت علیؑ کا جناب سیدہ کی زندگی میں کسی اور خاتون سے شادی نہ کرنا اور ان دونوں حضرات کا بعد میں دیگر خواتین سے عقد کرنا خود اس بات کی علامت ہے کہ کوئی شخص کتنا ہی بلند مرتبہ کیوں نہ ہو موت اس کے لیے مجبوریاں پیدا کرتی ہے۔

جہاں تک واقعات کربلا کی روایتیں آپ نے حوالے میں پیش کی ہیں آپ برائے مہربانی پہلے ان روایتوں کو کسی بھی معتبر کتاب میں دیکھ لیں تب ان پر بحث کریں۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ بنی اُمیّہ کے پورے دور میں زیادہ جھوٹ بولا گیا یا ہمارے شہر لکھنؤ میں ایک سال میں زیادہ جھوٹ بولا جاتا ہے، مگر میں اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ ہمارے یہاں جھوٹ عبادت سمجھ کر بولا بھی جاتا ہے اور سُنا بھی جاتا ہے اور اسی جھوٹ پر عقیدوں کی عمارت تعمیر کر لی جاتی ہے

جس طرح قرآن ہمارے لیے حجّت ہے اسی طرح حدیث بھی ہمارے لیے حجّت ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ قرآن بلاشک وشبہ اللہ کا کلام اور ہر تحریف سے پاک ہے۔ اس کے برخلاف احادیث کے ذخیرہ میں کافی

گڑبڑیاں پائی جاتی ہیں۔ چنانچہ ہم اپنے بنیادی عقائد و نظریات کو پہلے قرآن کی کسوٹی پر پرکھیں۔ جو حدیث یا روایت قرآن کریم سے ٹکراتی ہو تو اس کو ہم دلیل اور حجت نہیں قرار دے سکتے۔ مردوں کو زندہ کرنے کے جو واقعات گذشتہ دور میں ملتے ہیں ان میں روح اُسی جسم میں واپس آنے کی بات روایات میں ہے نہ کہ خالی روح (بغیر اپنے بدن کے) گھوم پھر رہی ہے۔ آخر زمانہ میں جناب عیسیٰ کی آمد کے جو لوگ قائل ہیں وہ جناب عیسیٰ کی صلیب پر موت نہیں مانتے ہیں۔

میری کتاب "سفرِ آخرت" میں جو قصہ درج ہے وہ کتاب استعاذہ کے حوالے سے لکھا گیا ہے۔ یہ کوئی حدیث نہیں ہے۔ اس کی توجیہہ یہ ممکن ہے کہ اس قاری نے اپنے بے فائدہ عمل سے پیچھا چھڑانے کے لیے یہ حرکت کی ہو تاکہ اس بادشاہ کے ورثا راہِ عمل اختیار کرلیں۔

وہ حیّ جس کو موت نہیں صرف اللہ تبارک و تعالیٰ کی ذات ہے جس کا کوئی شریک نہیں۔ جناب فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کی حیات ظاہری کا سلسلہ ۱۱ھ میں منقطع ہو گیا وہ اب اپنے رب کے پاس ہیں۔ ان کی آمد کے متعلق یا میدان کربلا میں ان کی موجودگی سے متعلق جتنی روایتیں ہیں وہ سب کوئی بنیاد نہیں رکھتی ہیں اور بعد کے دور میں گڑھی گئی ہیں۔ اولین دور میں ہمارے پاس شیخ مفید علیہ الرحمہ اور سید علی بن طاؤس علیہ الرحمہ کی کتابیں ہیں جو اس طرح کی ضعیف روایات و خرافات سے پاک ہیں۔

اسی طرح حالتِ نزاع اور قبر میں حضرت علی علیہ السّلام کی زیارت سے متعلق

روایات کو اگر اس رُخ سے دیکھا جائے کہ وہ بہ نفس نفیس تشریف لاتے ہیں تو درست نہ ہوگا۔ قرآن کریم میں آیا ہے:

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۝

"پس جو کوئی ذرہ برابر نیکی کرے گا اس کو دیکھ لے گا اور جو کوئی ذرہ برابر بدی کرے گا اس کو دیکھ لے گا" (سورہ زلزال آیت ۷، ۸)

اسی طرح احادیث وارد ہوئی ہیں کہ موت کے وقت اور قبر میں انسان کے اعمال جسم کی صورت میں آتے ہیں۔ اگر مرنے والا مومن ہے اور نیک اعمال انجام دیے ہیں تو اس کے اعمال پسندیدہ شکل میں اس کے پاس آئیں گے۔ اب اگر کوئی مومن ہے اور اس نے نیک اعمال انجام دیے ہیں تو اگر حضرت علیؑ کا محب ہے تو وہ اپنے اعمال کو حضرت علی علیہ السلام کی صورت میں دیکھ کر سکون و اطمینان پائے گا اور اگر منافق ہے اور حضرت علی علیہ السلام سے بغض رکھتا رہا ہے تو کیونکہ ان کو ناپسند کرتا تھا لہٰذا اس کے اعمال بھی حضرت علیؑ کی شکل میں مجسّم ہو کر آسکتے ہیں تاکہ حالت نزع اور قبر میں اس شخص کو اور اذیت ہو میرے نزدیک صرف یہی ایک توجیہہ ہے کہ جو اس طرح کی روایات کے لیے کی جا سکتی ہے۔

میں نے بہت اختصار سے اپنی بات کہی ہے۔ اگر کوئی بات واضح نہ ہوئی ہو تو آپ دوبارہ دریافت کر سکتے ہیں۔

اجتہاد و تقلید

ایک مُراسلہ اور اسُ کا جوابؒ

جناب اویس عابدی صاحب کا مراسلہ "اجتہاد و تقلید۔ عقلی دلائل و علمی گفتگو" کے عنوان سے موصول ہوا ہے۔ مراسلہ نگار نے اپنا پتہ نہیں لکھا ہے اور نام بھی غالباً درست نہیں تحریر کیا ہے۔ مگر کیونکہ یہ مراسلہ ایک مخصوص ذہنیت کی نمائندگی کر رہا ہے لہٰذا اس کو ہم لوگ شائع کر رہے ہیں۔

اجتہاد و تقلید۔ عقلی دلائل و علمی گفتگو

خداوند کریم نے انسانوں کی زندگی کے لیے ان کے تمام مسائل کے حل اور زندگی سے متعلق تمام احکام اپنی پاک و پاکیزہ کتاب قرآن مجید میں نازل فرمائے ہیں اور انھیں احکام کی تشریح کے لیے معصومینؑ نے تقریباً ۷۰،۳ ہزار احادیث ارشاد فرمائی ہیں۔ ایک مسلمان کو اپنی زندگی گزارنے کے لیے احکام الٰہی کا پورا علم ہونا ضروری ہے۔ ان احکامات

یہ مضمون پیام نو مورخہ ۴ر اکتوبر ۱۹۹۱ء کی اشاعت میں شائع ہو چکا ہے

کا علم درج ذیل تین طریقوں سے ہو سکتا ہے۔
(۱) اجتہاد (۲) احتیاط پر عمل (۳) تقلید۔

احتیاط سے متعلق گفتگو یہاں پر موضوع نہیں ہے۔ لیکن اجتہاد کے بارے میں چند باتیں عرض کرنا ضروری ہے۔ عربی زبان کی فصاحت و بلاغت سے مکمل واقفیت رکھنے والا انسان بلکہ یہ کہ عربی زبان پر عبور رکھنے والا شخص جب قرآن مجید اور احادیث کا اس قدر باریک مطالعہ کرتا ہے کہ اس کے اندر یہ صلاحیت پیدا ہو جائے کہ وہ قرآن اور احادیث میں پوشیدہ صحیح و سالم احکام الٰہی کو معلوم کر لے تب انسان کے اندر پیدا ہونے والی اس صلاحیت کا نام اجتہاد ہے۔ عربی زبان کی بلاغت کو یوں سمجھایا جا سکتا ہے کہ عربی میں ایک ایک لفظ کے ستّر ستّر معنٰی بھی ہوتے ہیں اور موقع اور محل کے اعتبار سے اس لفظ کے معنٰی بدل جاتے ہیں۔ جب انسان عربی زبان کی فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے اس زبان پر مکمل عبور حاصل کر لیتا ہے تب وہ اجتہاد کی راہ کے دوسرے زینے پر قدم رکھتا ہے نہ کہ قرآن مجید اور احادیث کے اردو اور دیگر نہایت محدود زبانوں کے ترجموں کے ذریعہ احکامِ الٰہی کو معلوم کر لیا جاتا ہے۔

زبان کے مسئلہ کے بعد راہِ اجتہاد کے راہی کو اور تمام باتوں کا جائزہ لینا ہوتا ہے مثلاً کون سی آیت کب نازل ہوئی۔ کس واقعہ سے متعلق نازل ہوئی۔ کن حالات میں نازل ہوئی۔ معصومؑ نے کون سی حدیث کب ارشاد فرمائی۔ اس حدیث کا ناقل کون ہے۔ ناقل کے حسب و نسب کا علم۔ وقتِ

صلح ارشاد فرمائی یا وقت جنگ ارشاد فرمائی، غلام سے بیان کی یا آزاد کے سامنے ارشاد فرمائی۔

اجتہاد کے مکمل طریقۂ کار کا ذکر یہاں پر مقصود نہیں ہے۔ صرف اس بات کا اندازہ کرانا چاہتا ہوں کہ حقیقی اور اصل زبان میں نازل ہونے والی کتاب الٰہی اور احادیث سے اس میں پوشیدہ پیغام اور احکام کو معلوم کرلینا کس قدر مشکل کام ہے۔ اس کا اندازہ یوں بھی لگایا جا سکتا ہے کہ جب ہم اپنی زبان میں لکھی کتابوں کو بغیر استاد کے اور سمجھانے اور بتانے والوں کے صحیح طور پر نہیں سمجھ سکتے تو یہ کیونکر ممکن ہے کہ قرآن مجید کو بغیر اس زبان کے سمجھے ہوئے صرف ترجمہ کے زور پر سمجھ لیا جائے۔ اس لیے نتیجہ کے طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایک عالم دین کی تمام عمر کا ایک بڑا حصہ اجتہاد کرنے میں صرف ہو جاتا ہے اور تب وہ اس منزل پر پہنچتا ہے جسے درجۂ اجتہاد کہا جاتا ہے۔ ایک ایک آیت اور ایک ایک حدیث کی اصل اور صحیح تفسیر بیان کرنے میں اسے ایک طویل عرصہ صرف کرنا پڑتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ عربی زبان کے ماحول میں پیدا ہونے والا بچہ بھی اپنی عمر کا ایک بڑا حصہ صرف کر کے اس منزل پر پہنچتا ہے جسے اجتہاد کہا جاتا ہے۔ یہ بات واضح ہے کہ قرآن مجید ایک مکمل اور انتہائی مختصر کتاب ہے۔ لیکن اس کے معنیٰ و مطالب بے حد فصیح و بلیغ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ صحیح معنیٰ اور مطالب سمجھنے کے لیے عربی زبان کا مکمل اور بہترین علم ہونا چاہیے۔

تقلید اس عمل کو کہتے ہیں جس میں احکامِ الٰہی کو مجتہد جامعۃ الشرائط

سے معلوم کر کے اس پر عمل کیا جاتا ہے۔ یہ بات سمجھنے کے قابل ہے کہ جب قرآن اور احادیث کا مکمل اور صحیح علم حاصل کرنے میں اتنی زندگی اور اتنا وقت صرف ہوتا ہے اور انسان پر احکامِ خدا کی پابندی اس کی بلوغت کے ساتھ ہی واجب ہو جاتی ہے تو پھر ہر پندرہ سال کا لڑکا اور ہر نو سال کی لڑکی اپنے اندر وہ صلاحیت کہاں سے لائے جو وہ خود قرآن اور احادیث سے احکامِ خدا کو معلوم کر سکے اور اگر ایک شخص نے اجتہاد کی منزل کو پا لینے کا قطعی فیصلہ کر ہی لیا ہے تو اُسے اگر فرض کریں کہ اجتہاد کرنے میں چالیس سال کی عمر گذر جاتی ہے تو پھر وہ اپنے سن بلوغت کے بعد کی پچیس سال کی زندگی میں بغیر کسی مجتہد جامعۃ الشرائط کی تقلید کیے ہوئے احکامِ الٰہی کو کس انداز سے ادا کرے گا۔ یہاں پر میں تقلید کے مخالفین سے یہ پوچھنا چاہوں گا کہ اگر انھوں نے اپنے اندر قرآن و احادیث سے صحیح اور مکمل احکامات معلوم کرنے کی صلاحیت اپنے اندر پیدا ابھی کر لی ہے تو کیا یہ صلاحیت ان کے اندر سن بلوغت تک پہنچتے پہنچتے ہی پیدا ہو گئی تھی؟ اگر نہیں تو پھر انھوں نے اپنے سن بلوغت کے پہنچنے کے بعد سے یہ صلاحیت حاصل کرنے تک بغیر تقلید کیے اپنے اعمال کس طرح انجام دے؟

خداوند کریم اور معصومینؑ نے حصول علم کی بہت تاکید کی ہے اور حکم دیا ہے کہ علم حاصل کرو لیکن کیا کوئی شخص اپنی اس مختصر سی زندگی کی اور تمام ضرورتوں کو پورا کرتے رہنے کے ساتھ ساتھ دنیا کے تمام علوم حاصل کر سکتا ہے؟ کیا وہ سارے علوم سے باخبر ہو سکتا ہے؟ کیا ایک انجنیئر جسم

انسانی کا علاج کر سکتا ہے؟ کیا ایک وکیل انجینئرنگ کا کام کر سکتا ہے؟ کیا ایک ڈاکٹر ادبی خدمات انجام دے سکتا ہے؟ اسی طرح کے نہ جانے کتنے علوم ہیں، کتنے شعبۂ حیات ہیں، انسان کون کون سے علم حاصل کرے گا اور اسی کے ساتھ دوسری بات جو غور طلب ہے وہ یہ کہ ایک ہندوستانی آدمی چین کی زبان سے واقف ہو سکتا ہے؟ کیا وہ فرانسیسی بھی جان سکتا ہے؟ کیا وہ جاپانی بھی سمجھ سکتا ہے؟ کیا وہ انگریزی بھی بول سکتا ہے؟ کیا وہ جرمن بھی لکھ سکتا ہے؟ دنیا میں ایک سے ایک بلیغ زبانیں موجود ہیں اور ان ہی میں سے ایک عربی بھی ایک نہایت فصیح و بلیغ تر زبان ہے۔ جب ہم آج اردو سماج میں آنکھیں کھولنے کے بعد بھی اپنی مادری زبان کو نہیں سمجھ سکتے، نہیں پڑھ سکتے، نہیں لکھ سکتے نہیں بول سکتے تو پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ ہم میں سے ہر شخص عربی ادب کا ماسٹر بن جائے اور پھر اجتہاد کی تمام سخت راہوں سے گذرتے ہوئے اپنی عمر کا ایک بڑا حصّہ صرف کر کے مجتہد بن جائے۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ ہندوستانی علماء میں بہت کم ایسے علماء گذرے ہیں جنھوں نے اس مرتبہ کو حاصل کر لیا ہو۔

آج دنیا میں علم حاصل کرنے کو بہت اہمیت دی جا رہی ہے اور اس کا انداز گروہ بندی کا ہے۔ ایک گروہ میں ڈاکٹر پائے جاتے ہیں دوسرے گروہ میں انجینیر، تیسرا گروہ ادباء کا ہے تو چوتھا وکلاء کا۔ اسی طرح ہر علم سے متعلق ایک گروہ بن گیا ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہے کہ ایک

ڈاکٹر بذات خود ڈاکٹر ہے لیکن ضرورت پڑنے پر وہ اپنے مسائل جو دوسرے علوم سے وابستہ ہوتے ہیں ان کے ماہرین سے معلوم کر لیتا ہے اور ان پر عمل کرتا ہے۔ مثال کے طور پر جب کوئی شخص بیمار ہوتا ہے تو وہ ڈاکٹر سے مشورہ کرتا ہے اور اس کی بتائی ہوئی دوا کو بغیر کسی تردّد کے کھا لیتا ہے اس لیے کہ وہ اس کے بارے میں خود کچھ نہیں جانتا، دنیوی امور میں اس عمل کو تقلید کہتے ہیں۔ یہی بات علم دین اور مذہب میں بھی لاگو ہوتی ہے۔ ہم نہیں جانتے کہ اگر حالتِ نماز میں شک ہو جائے تو حکمِ خدا کیا ہے؟ رمضان میں سفر کر رہے ہیں تو روزے کے لیے حکم خدا کیا ہے؟ اسی طرح کے تمام مسائل جن میں ہم نہیں جانتے کہ حکم خدا کیا ہے تو اس کو اپنے مقلَّد (مجتہد جامعۃ الشرائط) سے معلوم کرتے ہیں اور اس پر عمل کرتے ہیں اسی کو تقلید کہا جاتا ہے اور یہی وہ آسان طریقہ ہے جس کے ذریعہ احکامِ خدا کی مکمل پابندی ممکن ہے۔

تقلید کے موضوع پر آج کے دور میں جو غلط فہمیاں نوجوان ذہنوں میں پیدا ہو رہی ہیں ان کا دور ہونا بہت ضروری ہے ورنہ یہ قوم ایک اندھے کنویں میں گر جائے گی اور ہمارے تمام اعمال بے کار ہو جائیں گے۔ میں نے اس مختصر سے مضمون میں اجتہاد اور تقلید کی تشریح کرنے کی کوشش کی ہے اور کچھ عقلی و علمی دلائل کی مدد سے تقلید کی حقّانیت کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ افراد ملّت سے استدعا ہے کہ وہ اپنے اندر حقائق کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا کریں تاکہ گمراہ نہ ہوں۔ دین اور مذہب کے بارے

میں اپنی ذاتی رائے کا کہیں سے کوئی دخل بھی ممکن نہیں ہے۔ اپنے اعمال کو خداوند کریم کی بارگاہ میں قبول ہونے کے لائق بنانے کے لیے ضروری ہے کہ یا تو ہم خود قرآن و احادیث سے احکام الہٰی معلوم کر سکیں جس کے بارے میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ از حد مشکل کام ہے اور ہر ایک کے لیے ممکن نہیں ہے، دوسرے یہ کہ احتیاط پر عمل کریں اور تیسرے یہ کہ تقلید کریں۔

فقط اویس عابدی

جناب اویس عابدی صاحب سے میری گذارش ہے کہ ۲۲ر فروری ۱۹۹۱ء سے لے کر ۲۸ر جون ۱۹۹۱ء تک کے میرے مضامین کو دوبارہ غور سے پڑھیں خاص طور پر ۲۹ر مارچ ۱۹۹۱ء کا شمارہ ملاحظہ فرمائیں جس میں "دین آسان یا مشکل" کے عنوان سے جو گفتگو کی گئی ہے وہ شاید آپ کے نظریے کو درست کر سکے۔ (یہ مضامین کتابی صورت میں "دین کا بنیادی تصور۔ تقلید اور اتباع" کے عنوان سے شائع ہو چکے ہیں۔)

دین کا غلط تصور آپ نے اس لیے قائم کر لیا ہے کیونکہ آپ نے توحید اور نبوت کو بھی تقلیدی بنیادوں پر اخذ کیا ہے۔ اگر آپ کا توحید پر عقیدہ درست ہوتا اور آپ اللہ کو عادل مان رہے ہوتے تب آپ احکام الٰہی کو ناقابلِ فہم نہ قرار دیتے۔

اگر آج میں کسی شخص کو ملازم رکھوں اور اس کو کسی ایسی زبان میں حکم دوں جو وہ نہیں سمجھ سکتا، اور نہ ہی اس پورے ہندوستان میں کوئی شخص اس حکم کو اس سے بیان کر سکتا ہو اور پھر میں اُلٹے اس ملازم کو حکم کی تعمیل

نہ کرنے پر سزا دوں تو آپ بتائیے کہ میں عادل کہلاؤں گا یا ظالم؟

آپ خود تحریر فرماتے ہیں "دین اور مذہب کے بارے میں اپنی ذاتی رائے کا کہیں سے کوئی دخل نہیں ہے۔" مگر آپ کی ساری گفتگو صرف رائے اور خیال پر مبنی ہے اور آپ اپنی کسی بھی بات کی تائید میں نہ تو قرآن کریم کی کوئی آیت پیش کر سکتے ہیں اور نہ ہی کوئی حدیث پیش کر سکتے ہیں۔

آپ جان لیں کہ ہر شخص پر اجتہاد واجب ہے۔ جتنا جانتا ہے اس کے مطابق عمل کرے اور جو نہیں جانتا ہے اپنی صلاحیت بھر اس کو جاننے کی کوشش کرے۔ حصول علم کے لیے اہل علم سے سوال کرے۔ ایسی صورت میں اس کے لیے بنیادی ہدایت نامہ قرآن کریم رہے گا اور معصومین کی احادیث یا علماء کے فرمودات ذیلی حیثیت سے اس کی قرآن فہمی میں اضافہ کا باعث ہوں گے۔

آپ نے جو عربی زبان کی مشکلات کا تذکرہ کیا ہے وہ آپ کے قرآن سے لاعلم ہونے کو ثابت کرتا ہے۔ اللہ نے قرآن کو "روشن کتاب" اور "نور" سے تشبیہ دی ہے اور اس کی زبان کو "عربی مبین" کہا ہے یعنی روشن اور واضح عربی۔ اس کی زبان قرآن سمجھنے میں رکاوٹ نہیں بنتی ہے۔ جس طرح ٹارچ چاہے پیتل کی ہو، المونیم کی ہو یا پلاسٹک کی ہو کام اس کا روشنی دینا ہوتا ہے، اسی طرح قرآن سے رجوع کرنے والا اور اس سے ہدایت طلب کرنے والا ہدایت حاصل کر لیتا ہے۔ شرط یہ کہ وہ قرآن کی رو سے "متقی" ہو۔ یعنی قرآن کریم سے ہدایت حاصل کرنے کی شرط "تقویٰ" ہے نہ کہ عربی

زبان کی مہارت۔

اس کے علاوہ جہاں تک عربی زبان کی پیچیدگیوں کا تذکرہ ہے تو قرآن ہی کیوں، احادیثِ معصومینؑ بھی تو عربی ہی زبان میں ہیں اور ایران و عراق کے مراجع تقلید کے فتاوے بھی تو عربی یا فارسی زبان میں ہیں۔ پھر یہاں دوہری مصیبت ہے۔ آپ کی زبان اُردو ہے جو آپ کا مقلَّد نہیں جانتا اور آپ اس کی زبان نہیں جانتے؟

ڈاکٹری اور انجینیرنگ وغیرہ کی مثالیں صرف لوگوں کو بے وقوف بنانے کے لیے دی جاتی ہیں۔ یقین نہ آئے تو آپ "تقلید" کے لیے انگریزی زبان کا لفظ بتادیجیے۔ آپ کو انگریزی میں اس کے لیے کوئی مناسب لفظ نہیں ملے گا۔ اگر "تقلید" ایسے ہی فطری اور عقلی ضرورت کا نام ہے جیسا کہ آپ بیان کر رہے ہیں تو دنیا کی ہر زبان میں اس کا مساوی لفظ ملنا چاہیے اور پھر خود قرآن کریم کو بھی اس کا حکم دینا چاہیے تھا۔ جہاں کہیں کُفّار کا اپنے آباء واجداد کی اندھی پیروی کا تذکرہ ہے وہاں بھی لفظ تقلید نہیں استعمال کیا گیا ہے، کیوں؟ اس لیے کہ تقلید میں مُقلِّد کی شخصیت پر مُقلَّد کا کوئی اثر نہیں پڑتا ہے۔ جبکہ اتباع کرنے والا جس کا اتباع کرتا ہے اس کی شخصیت کا اثر قبول کرتا ہے چاہے یہ اثر ہدایت کا ہو یا گمراہی کا ہو۔

آخر میں قرآن کریم کی دو آیتیں پیش ہیں:

پہلی آیت سورۂ فرقان کی ۳۰ ویں آیت ہے جس میں ارشاد رب العزت ہے:

وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِى اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا ۝

"اور رسولؐ (روز قیامت بارگاہِ الٰہی میں) عرض کریں گے اے میرے رب میری قوم نے تو اس قرآن کو بے کار قرار دے لیا۔"

اور دوسری آیت سورۂ جمعہ کی پانچویں آیت ہے جس میں ارشاد ربّ العزت ہو رہا ہے:

مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا ؕ بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝

"ان لوگوں کی مثال جن کو توراۃ کی ذمہ داری عطا کی گئی اور انھوں نے اس ذمہ داری کو نہیں نبایا، اس گدھے جیسی ہے جس پر کتابیں لدی ہوں جن لوگوں نے اللہ کی آیتوں کو جھٹلایا ان کی کیا ہی بُری مثال ہے اور اللہ ظالموں کی ہدایت نہیں فرماتا۔"

والسلام

مرزا جاوید مرتضیٰ

عقیدہ پر چوٹ

گذشتہ شماروں میں جناب سیدہ کی صفِ عزا پر آمد کے متعلق کچھ عرض کیا گیا۔ اس موضوع سے مومنین کرام نے خصوصی دل چسپی کا اظہار کیا ہے جس کا ثبوت وہ متعدد مراسلات ہیں کہ جو ہم کو موصول ہوئے ہیں۔ ان میں سے چند مراسلات شائع بھی کیے گئے۔ مگر ہم اپنے محدود وسائل کی بنا پر تمام مراسلات کو شائع کرنے سے قاصر ہیں۔ ہاں اس منظر میں کچھ اصولی باتیں عرض کی جا سکتی ہیں۔

پہلی بات خود "عقیدہ" سے متعلق ہے۔ "عقیدہ" اور "مفروضہ" میں فرق ہوتا ہے۔ "مفروضہ" کسی بھی بات کا مان لینا ہے چاہے اس کے لیے کوئی ٹھوس دلیل ہو یا نہ ہو مگر یہ "مفروضہ" اسی وقت عقیدہ کہلائے گا کہ جب اس کو دلیلوں سے مانا جائے اور اس "عقیدہ" کی نوعیت ایسی ہو کہ وہ ہماری عملی زندگی پر اثر انداز ہو۔ اگر ہم کسی بات کو مانتے ہوں مگر اس کے لیے کوئی دلیل نہ رکھتے ہوں تو وہ "عقیدہ" ہے ہی نہیں۔

اگر کوئی شخص یہ کہے کہ میرا عقیدہ ہے کہ جناب سیدہ صفِ عزا پر تشریف لاتی ہیں، مگر اس کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے تو اس کے معنی!

یہ مضمون پیامِ نو مورخہ ۲۵ ر اکتوبر ۱۹۹۱ء کی اشاعت میں شائع ہو چکا ہے۔

یہ ہیں کہ وہ "عقیدہ" کے معنیٰ سے ہی بے خبر ہے۔

ہر شخص اپنے عقائد، نظریات اور مفروضات میں آزاد ہے جو چاہے مانے۔ دین میں کوئی جبر نہیں ہے۔ مگر جب وہ اپنے مفروضات کو شیعہ عقائد یا اسلامی عقائد کا نام دے گا تو لامحالہ اس کو ثابت کرنا پڑے گا کہ وہ سچ کہہ رہا ہے یا جھوٹ بول رہا ہے۔ اگر کوئی صاحب "جناب سیدہ کی آمد" کو شیعی عقیدہ قرار دے رہے ہیں تو وہ نہج البلاغہ یا صحیفۂ سجادیہ کی کوئی عبارت یا کسی بھی امام کا کوئی قول اپنی تائید میں پیش کریں۔ یہ کہنا کہ جناب عزیرؑ کا گدھا زندہ ہو گیا لہٰذا جناب سیدہ بھی آسکتی ہیں، یا یہ کہ فلاں شہید کی لاش آج بھی تر و تازہ ہے لہٰذا جناب سیدہ بھی آسکتی ہیں یہ سب باتیں دلیل نہیں بلکہ بے تکی باتیں ہیں۔

ایک عالم دین مجلس پڑھ رہے تھے۔ اتفاق سے میں بھی شریک تھا۔ انھوں نے فرمایا: "آپ ان آنسوؤں کو معمولی نہ سمجھیے گا، جناب سیدہ مجلس میں تشریف لاتی ہیں، یہ آنسو رومالِ سیدہ کی زینت بنتے ہیں، وہی ان آنسوؤں کا روزِ قیامت اجر دلوائیں گی۔" اگلے روز میں ان کے شریعت کدہ پر حاضر ہوا اور میں نے کہا کہ یہ آپ کل کیا پڑھ رہے تھے؟ جناب سیدہ کی بات کہاں سے آگئی؟ انھوں نے کہا کیا کروں زہر مار ملانا پڑتا ہے۔

ایسے ہی ایک اور ذی علم شخصیت کہ جن سے میری گفتگو اس موضوع پر پہلے ہو چکی تھی اور جو میرے ہم خیال ہیں مگر مجلس پڑھتے وقت انھوں نے بھی مصائب کی منزل میں جناب سیدہ کو روز عاشورہ کربلا میں بُلا

لیا۔ مجلس کے بعد مجھ سے مصافحہ کرتے وقت انھوں نے افسوس کے ساتھ کہا کہ مجھے بھی زہر مار ملانا ہی پڑ گیا۔

آپ پوچھیں گے کہ یہ ”زہر مار“ کسے کہتے ہیں تو ایک عالم دین نے ان روایتوں کو کہ جو جھوٹ ہیں مگر لوگوں کو رُلانے کے لیے منبر سے بیان کی جاتی ہیں ”زہر مار“ کا نام دیا ہے۔ اس ”زہر مار“ سے بچنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ ہم اپنے اوّلین دور کے علمار کی تحریروں کو پیش نظر رکھیں۔

آج ذاکری میں اتنا جھوٹ شامل ہو چکا ہے کہ ذاکر مجبور ہے جھوٹ بولنے کے لیے۔ ذاکر جانتا ہے کہ اُس کی مجلس اُسی وقت کامیاب کہلائے گی کہ جب ”فضائل“ کے نام پر ایسی باتیں پڑھے کہ ”واہ واہ“ کے شور سے چھت اُڑنے لگے اور جب ”مصائب“ کی منزل آئے تو ایسا رونا ہو کہ ٹپّس پڑ جائے۔ ایک زمانہ تھا کہ فلک پر محرّم کا چاند نمودار ہوتے ہی سارا شہر سوگوار نظر آتا تھا اور گھروں سے رونے کی آوازیں بلند ہونے لگتی تھیں۔ آج ”شقاوت“ اس منزل پر آگئی ہے کہ محرّم کے چاند کی وہ تاثیر ختم ہو گئی۔ اب تو سوکھے گلے پر کند چھری چلنے کے تذکرہ سے بھی گریہ نہیں ہوتا اور ذاکرین کو نئے نئے ”زہر مار“ ایجاد کرنے پڑتے ہیں۔

ایک جلیل القدر عالم دین کا ارشاد ہے کہ آج اگر کوئی شخص امام حسینؑ کے مصائب پر گریہ کرنا چاہے تو اُسے چاہیے کہ وہ اس جھوٹ پر روئے کہ جو اُن کی عزاداری میں شامل کر دیا گیا ہے۔

آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اور آپ اس جھوٹ کے خلاف بیدار ہوں، اگر آج ہم واقعات کربلا کو جھوٹ سے محفوظ نہیں رکھ سکتے ہیں تو میدان جنگ میں امام حسینؑ کی نصرت کرنے کا خیال کیسے ذہن میں لا سکتے ہیں؟

قضیہ سے فائدہ یا نقصان

۲۹ر دسمبر ۱۹۹۱ء کو بمبئی کے دربارِ حسینی ہال (مقابل امامیہ مسجد) میں منعقد ہونے والے دوسرے کل ہند احترام منبر سمینار کے عنوانات میں سے ایک عنوان ہے "قضیۂ کتاب شہیدِ انسانیت سے شیعیت کو پہنچنے والا نفع یا نقصان"۔ میرے بعض کرم فرماؤں نے فرمائش کی ہے کہ میں اس عنوان پر کچھ روشنی ڈالوں کیونکہ بقول ان کے یہ موضوع کچھ عجیب سا معلوم پڑ رہا ہے۔

تاریخ شیعیت میں سب سے پُرانا قضیہ فقہاء اور محدثین کا ہے کہ جو عام طور پر اُصولی اور اخباری قضیہ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس قضیہ میں بڑی گرما گرم بحثیں ہوئیں۔ ایک دوسرے کی رد میں کتابیں لکھی گئیں اور ایک دوسرے کو کفر، ارتداد اور گمراہ ہوجانے کے سرٹیفکٹ دیے گئے لیکن اس کے باوجود اس قضیہ سے شیعیت کو بہت فائدہ پہنچا۔ فائدہ ان معنوں میں کہ جہاں اصولیین نے اپنے نظریہ اور طرز استدلال و استنباط احکام پر معرکۃ الآرا کتابیں اور رسائل تحریر کیے وہیں محدثین اور اخباریوں نے احادیث و اخبار کے مجموعے تیار کیے۔ محدثین اور اخباری رجحان رکھنے والے علماء میں علامہ کلینی، شیخ صدوق، محسن الفیض، یوسف بن احمد البحرینی

یہ مضمون پیامِ نو مورخہ ۸ر نومبر ۱۹۹۱ء کی اشاعت میں شائع ہو چکا ہے۔

محمد امین الاستر آبادی، نعمت اللہ بن عبد اللہ الجزائری، محمد بن حسن الحر عاملی اور علامہ باقر المجلسی کے نام نمایاں ہیں۔ اصولی طرز فکر رکھنے والے علماء میں شیخ مفید، سید مرتضیٰ، ابن ابی عقیل، ابن الجنید، المحقق الکراکی، بہاء الدین عاملی، محمد باقر استر آبادی، مقدس اردبیلی، وحید بہبہانی، محمد مہدی بن مرتضیٰ طباطبائی بحر العلوم، جعفر بن خضر النجفی کاشف الغطاء، علی بن محمد علی صاحب الریاض احمد بن محمد مہدی الزاقی، محمد حسن بن محمد باقر النجفی، شیخ مرتضیٰ انصاری، محمد حسن بن محمود الشیرازی المجدد، محمد کاظم بن حسین الخراسانی، محمد کاظم بن عبد العظیم طباطبائی، عبد الکریم بن محمد جعفر الیزدی الحائری، ضیاء الدین بن محمد العراقی، حسین بن علی طباطبائی بروجردی، محسن بن مہدی طباطبائی الحکیم، ابو القاسم الخوئی اور روح اللہ الموسوی الخمینی کے نام خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ تاریخ شیعیت میں دو دور ایسے گزرے ہیں کہ جب محدثین اور اخباری نظریہ کے علماء کو فوقیت اور بالادستی حاصل رہی۔ پہلا دور چوتھی صدی ہجری تک کا زمانہ ہے اور اسی دور میں احادیث کے اوّلین مجموعے الکافی اور مَن لَا یحضرہ الفقیہ مرتب ہوئے۔ اور دوسرا دور گیارہویں صدی ہجری سے بارہویں صدی ہجری کے آخر تک کا زمانہ ہے اور اس دور میں احادیث کے بڑے مجموعے الوافی، وسائل الشیعہ اور بحار الانوار مرتب ہوئے۔ اسی طرح اصولی علماء کی محنتوں سے دین میں عقل کی برتری پر خصوصی توجہ اور تفقہ فی الدین کی سمت خصوصی پیش رفت ہوئی اور ہزاروں کی تعداد میں کتابیں لکھی گئیں۔ اور یہ بات بغیر کسی تردد کے

کہی جاسکتی ہے کہ عام طور پر اصولی اور اخباری قضیہ شیعیت کے لئے فائدہ مند ثابت ہوا۔

لیکن کیا قضیۂ کتاب شہید انسانیت بھی شیعیت کے لیے فائدہ مند ثابت ہوا؟ اور اگر نہیں تو کیوں؟

آج سے تقریباً پچاس برس قبل سیّد العلماء مولانا سید علی نقی عرف نقّن صاحب کی کتاب "شہید انسانیت" شائع ہوئی۔ اردو زبان میں واقعۂ کربلا پر لکھی جانے والی یہ پہلی جامع کتاب تھی۔ اس کتاب "شہید انسانیت" کی چند روایتوں کو لے کر مخالفت کا طوفان اٹھا اور پورے ہندوستان کے شیعہ دو ٹکڑیوں میں بٹ گئے۔ کتنے رشتے ٹوٹ گئے، کتنے گھروں میں دیواریں اٹھ گئیں اور کتنی طلاقیں ہوگئیں، اس کا علم اللہ کو ہے۔ مخالفت کرنے والے صحیح تھے یا غلط اس سے ہم کو بحث نہیں ہے۔ اگر اس ایک کتاب "شہید انسانیت" کے مقابلہ میں پندرہ بیس کتابیں واقعۂ کربلا کے متعلق اس سے بہتر اور جامع شائع ہو جاتیں تو ہم یہ کہہ سکتے تھے کہ شیعیت کو اس قضیہ سے فائدہ ہوا۔ مگر افسوس کہ "کتاب" کی مخالفت نے آگے چل کر پہلے "قلم" کی مخالفت اور پھر "علم" کی مخالفت کی صورت اختیار کرلی۔ اور اس پچاس برس کے عرصہ میں پورے ہندوستان میں واقعہ کربلا پر کوئی ایک بھی ایسی کتاب نہیں لکھی گئی کہ جسے "کتاب شہید انسانیت" کے مقابلہ پر پیش کیا جاسکے۔ بلکہ جو ذی علم شخصیتیں تھیں انھیں اتنا خوف لاحق ہوگیا کہ "قلم" کو ان لوگوں نے بالائے طاق رکھ دیا اور بغض و عناد

کی وجہ سے ہمارے معاشرہ میں وہ ذہنیت پیدا ہوگئی کہ جو "کافرانہ ذہنیت" ہے۔ یعنی انسان علم سے ڈرنے لگے اور علم کی مخالفت کرنے لگے۔ چنانچہ گذشتہ علمار کی کتابیں بھی الماریوں میں بند رہ گئیں یا دیمکوں کی نذر ہو گئیں۔ ایک علمی خانوادہ کے فرد سے جب یہ گذارش کی گئی کہ وہ اپنے بزرگوں کی کتابوں کی فوٹو کافی کر لینے دیں تو انھوں نے انکار کر دیا کہ کیا میں ان کو ماں بہن کی گالیاں کھلوانے کا انتظام کر دوں؟

بہر حال ان سب کے باوجود حالیہ برسوں میں ایک خوش آئند کام یہ ہوا کہ اگر ہندوستان میں کتابیں نہیں لکھی گئیں تو اس کی کسریوں پوری ہوگئی کہ پاکستان اور ایران سے شیعہ علمار کی کتابوں کے ترجمے شائع ہونے لگے ہیں۔ لیکن بہر حال نقصان یہ ضرور ہوا کہ برصغیر ہندو پاک میں لکھنؤ کی علمی مرکزیت ختم ہوگئی۔

آج ضرورت اس بات کی ہے کہ اس "کافرانہ ذہنیت" سے مقابلہ کیا جائے کہ جس نے جہالت کی بنا پر لوگوں کو علم سے دور کر دیا ہے اور لوگ محض سنی سنائی باتوں اور خود ساختہ عقائد کو مذہب حق اور شیعیت سمجھ بیٹھے ہیں اور اپنے ذہن سے ٹکرانے والی ہر حق بات کو وہابیت، کفر اور ارتداد کا نام دے بیٹھے ہیں۔

اگر عوامی ذہن اس "کافرانہ ذہنیت" سے پیچھا چھڑا لے کہ جس کا حامل انسان اپنی نفسانی خواہشات اور نظریات کے خلاف باتوں کو سننے کو تیار ہی نہیں ہوتا اور اندھی مخالفت شروع کر دیتا ہے، تو آج بھی شیعانِ ہند

اور خاص طور پر شیعانِ لکھنؤ کی تقدیر بدل سکتی ہے۔ اگر افراد ملت یہ سمجھ لیں کہ چاہے وہ مولانا نقن صاحب ہوں یا کوئی اور عالم دین ہو، اس کی تحریر میں غلطی کا امکان پایا جاتا ہے۔ دنیا کی واحد کتاب کہ جو ہر طرح کی افراط و تفریط سے پاک ہے وہ "قرآن" ہے۔ لہٰذا جب ہم کسی کتاب کا مطالعہ کریں تو اس کے بارے میں یہ سوچنا کہ وہ کتاب قرآنِ کریم ہی کی طرح سو فیصد درست ہو گی قطعی احمقانہ مطالبہ ہو گا لہٰذا جو باتیں درست ہوں ان کو قبول کر لیں اور جو باتیں غلط ہوں یا سمجھ میں نہ آتی ہوں ان کو چھوڑ دیں تا اینکہ حق ہم پر واضح ہو جائے۔ یہی اصول خود پروردگار عالم نے قرآن کریم میں بھی پیش کیا ہے۔ سورۂ آل عمران کی ساتویں آیت میں ارشاد ہوا

هُوَ الَّذِيٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ؕ فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِيْلِهٖ ج

"وہ (اللہ) وہی ہے کہ جس نے تم پر کتاب (قرآن) کو نازل کیا کہ جس میں محکم اور واضح آیتیں ہیں اور دوسری متشابہات ہیں۔ پس جن کے دلوں میں کجی ہے وہ ان میں سے ان ہی آیتوں کے پیچھے پڑے رہتے ہیں کہ جو متشابہات میں سے ہیں تاکہ اس کے ذریعہ سے فتنہ برپا کریں اور اس کو اپنے مطلب کی باتوں پر ڈھالیں۔"

جب تک ہم لوگ قرآن کے پیش کردہ اصولوں اور رسول اکرمؐ و ائمہ طاہرینؑ کے اخلاق و اسوہ کو نہیں اپنائیں گے اس وقت تک جہالت کی تاریکیوں سے چھٹکارا نہیں ملے گا۔

دین کا المیہ

ہر وہ شخص کہ جو دین کی سر بلندی اور مسلمانوں کی بہتری کا خواہاں ہے وہ اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ ملت اسلامیہ میں افتراق ہی اس انتشار کا بنیادی سبب ہے اور یہ افتراق صرف اس بنیاد پر پیدا ہوا ہے کہ مسلمانوں نے اللہ کے عطا کردہ قوانین و اصول کو پس پشت ڈال کر خود اپنے پیمانے مقرر کر لیے۔ اور نتیجتاً باہم ایک دوسرے سے دست بگریباں گروہوں میں بٹ گئے۔ موجودہ صورت حال یہ ہے کہ خواہ وہ کسی بھی مسلک سے تعلق رکھتا ہو، ہر مسلمان اپنی شناخت "اسلام" سے وابستہ کرنے کے بجائے اپنے مسلک سے وابستہ کرتا ہے۔ یعنی شیعہ اپنے کو مسلمان کہلانے کے بجائے شیعہ کہلانا اور سُنّی اپنے کو مسلمان کہلانے کے بجائے سُنّی کہلانا پسند کرتا ہے۔ جبکہ قرآن آواز دے رہا ہے:

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝ (سورہ آل عمران آیت ۸۵)

"اور جو شخص اسلام کے سوا کسی اور دین کی خواہش کرے تو اس کا وہ دین ہرگز قبول ہی نہ کیا جائے گا اور آخرت میں گھاٹا اٹھانے والوں میں ہوگا۔"

یہ مضمون پیام نو مورخہ ۱۵ر نومبر ۱۹۹۱ء کی اشاعت میں شائع ہو چکا ہے۔

آج مسالک نے دین کی جگہ اختیار کر لی ہے اور اپنے طور پر دین میں افراط و تفریط کے ذریعہ اس طرح رنگ آمیزی کی گئی ہے کہ وہ خود دین کے دھارے سے الگ اور نمایاں ہو جائے۔ اگر یہ شناخت محض شناخت کی حد تک محدود ہوتی تو کوئی مسئلہ نہ اُٹھ کھڑا ہوتا لیکن ستم یہ ہوا کہ اس شناخت کو تفوق و برتری کا ذریعہ بنا لیا گیا۔ یعنی اب شیعہ اپنے کو سُنّی سے برتر اور اصلی مومن سمجھ رہا ہے اور سُنّی اپنے کو شیعہ سے برتر اور سچّا مومن مان رہا ہے! اس طرح مسالک نے قبائلی عصبیت کی جگہ اختیار کر لی۔ جبکہ اسلام اس طرح کے تعصب و تنگ نظری کو مٹانے کے لیے آیا تھا۔ اسلام نے بزرگی کا صرف ایک پیمانہ نوع انسانی کو دیا ہے اور وہ ہے "تقویٰ"۔

سورۂ حجرات کی ۱۳ ویں آیت میں ارشاد ہوا:

يَاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ط اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ ط اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ٥

"اے لوگو! ہم نے تم سب کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے اور تمھیں قوموں اور قبیلوں میں بنایا ہے تاکہ ایک دوسرے کی شناخت کر لے۔ بے شک اللہ کے نزدیک تم میں زیادہ عزت والا وہ ہے جو زیادہ متقی ہے۔ بے شک اللہ ہر بات کا علم رکھنے والا اور ہر شئے سے باخبر ہے۔"

اس آیۂ کریمہ کے مطابق گروہ اور قبیلے محض پہچان کا ذریعہ ہیں بلندی و

پستی کا پیمانہ نہیں ہیں، عزت و ذلت کا معیار نہیں ہیں۔ بلکہ عزت کا ایک ہی پیمانہ ہے اور وہ یہ کہ کون کتنا متقی ہے۔ ظاہر سی بات ہے کہ تقویٰ صرف ایمان یا عقیدہ کا نام نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ ایک عمل کا پہلو جڑا ہوا ہے۔ کون کتنا نیک اعمال انجام دے رہا ہے اور کتنا بداعمالیوں سے بچ رہا ہے؟ اسی طرح تقویٰ کا یہ بھی مطالبہ ہے کہ دین کی حفاظت کی جائے۔ اسے افراط و تفریط سے بچایا جائے۔ کیونکہ چاہے افراط ہو یا تفریط وہ راہِ عدل یا صراطِ مستقیم سے انحراف کا نام ہے۔

اس افراط یا تفریط کا آغاز عقائد کے نام پر ہوتا ہے اور پھر اس کو اتنی اہمیت دے دی جاتی ہے کہ اصل عقائد کی اہمیت ہی ختم ہو جاتی ہے۔ مثلاً اسلام کا بنیادی عقیدہ اللہ پر ایمان یا توحید کا عقیدہ ہے۔ مگر عملی صورتِ حال یہ ہے کہ اگر کوئی شخص توحید کا منکر ہے تو اس سے ہمیں کوئی بے چینی نہیں ہوتی اور ہماری طرف سے کوئی ایسی کوشش نہیں ہوتی کہ ہم اس منکرِ توحید کو قائل کر کے دائرۂ اسلام میں لے آئیں۔ اس کے برخلاف ہمارے خود ساختہ عقائد کو اگر کوئی نہ مانے تو ہمیں بڑی اذیت ہوتی ہے اور ہم اس وقت تک بے چین رہتے ہیں کہ جب تک ہم اس کو اتنی اذیت نہ پہنچا لیں کہ ہمیں تسلی ہو جائے۔ اور اذیت اس لیے پہنچانا چاہتے ہیں کیونکہ اپنے عقائد یا نظریات کو حق ثابت کرنے کے لیے ہمارے پاس کوئی دلیل نہیں ہوتی ہے۔ اور جن خود ساختہ عقائد پر ہم لڑنے مرنے کو تیار ہو جاتے ہیں اُن کا قرآنی آیات یا تعلیماتِ رسولِ اکرمؐ میں کوئی تذکرہ نہیں پایا جاتا۔ اور پھر جیسے جیسے تاریخ کا قافلہ

آگے بڑھتا ہے، عصبیت و تنگ نظری کا دائرہ اور سکڑتا جاتا ہے اور ہر مسلک کے اندر داخلی گروہ بندیاں پنپنے لگتی ہیں اور جو طوفان بدتمیزی مسلک کے اختلاف کے نام پر پہلے روا اور جائز کیا جا چکا تھا اس سے کہیں زیادہ بے ہودگیاں اس داخلی گروپ بازیوں میں جائز ہو جاتی ہیں۔ اس کی مثال حضرات اہل سنت میں دیوبندی، بریلوی جھگڑا یا شیعہ حضرات میں نقتیے، سعیدیے کا جھگڑا ہے۔ آج مذہب کے نام پر کتنے بُت بن گئے ہیں۔ علمار کی ذمہ داری ہے کہ وہ ان بتوں کو توڑیں مگر دین کا المیہ یہ ہے کہ جن علمار کو یہ بُت شکنی کی ذمہ داری اور سُنّت ادا کرنی تھی انھوں نے خود اپنی شخصیتوں کے بت تراش لیے ہیں۔ دین مٹتا ہے تو مٹ جائے ہماری شخصیت کا بت سلامت رہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس "حکمت عملی" سے وقتی مفر میں رہیں مگر آگے کیا ہوگا؟ یہ جو آج آخرت سے بے پرواہ ہو کر دنیوی مال وجاہ کے پیچھے دوڑا جا رہا ہے آخر اس کا کیا انجام ہونا ہے؟ یہ جو آخرت پر دنیا کو ترجیح دی جا رہی ہے کیا یہی اسلام کی تعلیم ہے؟

بہرحال اللہ کا وعدہ ہے کہ اس کا دین غالب آئے گا، اس کی دو ہی صورتیں ہیں۔ پہلی صورت تو یہ ہے کہ مسلمانوں کے ہر مسلک و گروہ سے ایسے افراد اُٹھ کھڑے ہوں جو مروجہ افراط و تفریط سے اپنا دامن پاک رکھ کر قرآن کریم اور سیرتِ رسولِ اکرمؐ کی روشنی میں عقل کی کسوٹی پر پرکھ کر دین کو اخذ کریں اور اپنے حلقۂ اثر میں اس پیغام کو عام کریں۔ ورنہ دوسری صورت یہ ہے کہ پھر اللہ کسی اور قوم کو اپنے پیغام کے لیے منتخب کر لے جیسا کہ اس نے

سورہ مائدہ کی ۵۴ ویں آیت میں فرمایا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَن يَرْتَدَّ مِنكُمْ عَن دِينِهِ فَسَوْفَ يَأْتِي اللَّهُ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ أَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ أَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِينَ يُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ ذَٰلِكَ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَن يَشَاءُ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ٥

"اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! تم میں سے جو کوئی اپنے دین سے پھر جائے تو (وہ جان لے کہ) عنقریب اللہ (اس کی جگہ) ایسی قوم لائے گا کہ جنھیں اللہ دوست رکھتا ہوگا اور وہ اللہ کو دوست رکھتے ہوں گے جو مومنین کے لیے نرم دل اور منکسر المزاج ہوں گے (مگر) کفار کے لیے سخت ہوں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پرواہ نہ کریں گے یہ اللہ کا فضل ہے کہ وہ جس کو چاہتا ہے عطا کرتا ہے اور اللہ بہت وسعت والا اور جاننے والا ہے۔"

آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ہمارے علماء و خطباء رائے عامہ کی مخالفت سے ڈرنے کے بجائے خوفِ الٰہی اور فکرِ آخرت کو مقدم قرار دیں۔ اور مسلک کے اختلافات، خود ساختہ عقائد اور جھوٹی روایتوں کی بنیاد پر بغض و نفاق کا شکار ہونے والوں کو قرآن کریم کی یہ تعلیم یاد دلائیں کہ جہاں قوم بنی اسرائیل سے خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّورَ خُذُوا

مَآ اٰتَیْنٰکُمْ بِقُوَّۃٍ وَّاسْمَعُوْا ؕ قَالُوْا سَمِعْنَا وَعَصَیْنَا ق وَاُشْرِبُوْا فِیْ قُلُوْبِہِمُ الْعِجْلَ بِکُفْرِہِمْ ؕ قُلْ بِئْسَمَا یَاْمُرُکُمْ بِہٖٓ اِیْمَانُکُمْ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ٥

''اور (وہ وقت یاد کرو) جب ہم نے تم سے عہد لیا اور کوہ طور کو تمھارے اوپر بلند کر دیا (اور کہا) جو ہم نے تم کو عطا کیا ہے اسے مضبوطی سے تھام لو اور سنو، تو کہنے لگے ہم نے سُنا اور ہم اس کی نافرمانی کرتے ہیں۔ ان کے کفر کی وجہ سے ان کے دل بچھڑے کی محبت سے بھر گئے تھے (اے رسول) ان سے کہو اگر تم مومن تھے تو تمھارا ایمان کتنی بری باتوں کا حکم دیتا تھا'' (سورہ بقرہ آیت ۹۳)

اس آیۂ کریمہ کے آخری فقرہ پر دوبارہ غور فرمائیں۔ اس میں یہ سوال پیش کیا گیا ہے کہ اگر تم مومن ہو تو غور کرو کہ تمھارا ایمان تمھیں بری باتوں کا حکم کیسے دے رہا ہے؟ دین کے نام پر گالیاں بکنا، مومنین کو ستانا، اسلام کی صفوں میں رخنہ ڈالنا ایمان کا تقاضہ نہیں ہے۔ اگر کسی کی محبت میں، کسی کی خوشنودی میں یا کسی کی اطاعت میں یا کسی نظریہ کی حمایت میں کوئی شخص اللہ کی نافرمانی کرتا ہے، حدودِ الٰہی سے تجاوز کرتا ہے تو اس کا عمل اس کے ایمان کی نہیں بلکہ اس کے کفر کی علامت ہے۔ جس طرح بنی اسرائیل کے دلوں میں بچھڑے کی محبت گھر کر گئی تھی اسی طرح ان نافرمانوں نے بھی اپنے معبود گڑھ لیے ہیں کہ جن کے نام پر یہ لوگ معبودِ حقیقی کی نافرمانی کو جائز و روا قرار دے لیتے ہیں۔ سورہ بقرہ کی ۱۶۵ ویں آیت میں ارشادِ

رب العزت ہے:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ وَلَوْ يَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ ۙ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعَذَابِ ۝

"اور لوگوں میں کچھ ایسے ہیں کہ جنھوں نے اللہ کے ہمسر بنا لیے ہیں اور ان سے محبت رکھتے ہیں کہ جیسی (صرف) اللہ سے رکھنی چاہیے اور جو صاحبانِ ایمان ہیں وہ سب سے بڑھ کر اللہ سے محبت رکھتے ہیں اور کاش ان ظالموں کو وہ بات سجھائی پڑتی کہ جو عذاب دیکھنے پر سجھائی دے گی کہ ہر طرح کی قوت اللہ ہی کو حاصل ہے اور بے شک اللہ سخت عذاب نازل کرنے والا ہے۔"

ذاکری کی اجرت

آج کے دور میں ذاکری نے ایک باقاعدہ فن اور پیشہ کی صورت اختیار کرلی ہے۔ ایک ایسا پیشہ کہ جس میں نقصان کا کوئی اندیشہ نہیں ہے بلکہ نفع ہی نفع ہے۔ دولت کے ساتھ معاشرہ میں ایک امتیازی مقام بھی حاصل ہوجاتا ہے اور مومنین ان پیشہ ور ذاکرین کو انتہائی تعظیم وتکریم سے نوازتے ہیں۔ اور اب یہ عالم ہے کہ ذاکرین حضرات باقاعدہ فیس یا اجرت کے لیے مول تول کرتے ہیں۔ کیا ذاکری کی اجرت لینا جائز ہے؟ یہ وہ سوال ہے کہ جس پر ہم آج گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔

دین کی بنیاد اللہ کی معرفت ہے۔ اللہ کی معرفت کا تقاضہ ہے کہ لوگ اپنے آپ کو عاجز، ذلیل اور محتاج بندہ سمجھیں۔ خداوند عالم کے سوا کسی کو خالق و رازق اور محافظ نہ جانیں۔ اپنی حاجت اسی سے مانگیں، مصیبت کے ٹلنے کا سوال اسی سے کریں۔ اگر گناہ کریں تو معافی اور درگذر کے لیے اسی کے آگے زاری کریں۔

شریعت نے بندوں کے لیے کچھ اعمال اور آداب مقرر کیے ہیں جن میں سے بعض اعمال دل سے تعلق رکھتے ہیں اور بعض اعضاء و جوارح

یہ مضمون پیام نو مورخہ ۲۹ نومبر و ۶ دسمبر ۱۹۹۱ء کی اشاعتوں میں شائع ہوچکا ہے۔

سے متعلق ہیں تاکہ لوگ ان اعمال و آداب کے ساتھ خدا سے اپنی حاجتیں مانگیں، اظہار بندگی کریں، عجز و اضطرار اور اپنی احتیاج کا اعتراف کریں اور اس عمل اور کیفیت کو عبادت اور عبودیت کہتے ہیں۔ اس کا حقیقی معنیٰ ہے پرستش اور بندگی کرنا۔ اور یہ عبادت اس وقت تک درست اور مکمل نہیں ہوتی جب تک کہ عابد اپنی حالت اور کیفیت کو اللہ کے لیے خالص نہ کرلے اور "عبادت و عبودیت" میں خداوند عالم کا کسی کو شریک نہ بنائے۔ یعنی عبادت صرف تقرب الٰہی اور رضائے الٰہی کے حصول کے لیے انجام دے۔ سورۂ حمد میں آیہ مبارکہ اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ (ہم صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور بس تجھ ہی سے مدد طلب کرتے ہیں) اسی حالت و کیفیت کا اظہار ہے۔

ہمارا عقیدہ ہے کہ ذکر فضائل و مصائب اہل بیت علیہم السّلام عبادت ہے اور موجب اجر و ثواب ہے۔ مصائب آلِ محمد علیہم السّلام پر شیعوں کو رُلانا اور مومنین سے گریہ کرانا بھی خود رونے کی طرح عبادت مؤکّدہ اور پسندیدہ مستحبات میں ہے اور ائمۂ معصومین علیہم السّلام نے اس کا حکم بھی فرمایا ہے اور مومنین کے رُلانے پر تحریص و ترغیب دلائی ہے اور اس عمل کے لیے بہترین اجر اور ثواب بیان فرمایا ہے۔ اس طرح مصائب اہلِ بیت پر رونا رُلانا عبادت کی ایک صنف میں سے ہے اور دیگر عبادات کی طرح یہ عبادت بھی خلوص کے ساتھ قربۃً اِلَی اللہ رضائے الٰہی کے حصول کے لیے انجام دی جانی چاہیے۔

ذکرِ حسینؑ سن کر گریہ کر لینا ہر مومن کے لیے ممکن ہے اور آسان ہے۔ مگر خود ذکر حسینؑ کرنا، مجلس پڑھنا اور دوسروں کو رُلانا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے اور نسبتاً مشکل کام ہے۔

جو حضرات ذکر حسینؑ کرتے ہیں اور دوسروں کو رُلاتے ہیں وہ بیشک ایک بہترین سنت کو ادا کرتے ہیں اور بہترین عبادت کو انجام دیتے ہیں۔ مگر انھیں ضرور جاننا چاہیے اور اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ یہ عبادت بھی دوسری عبادات کی طرح ہے اور یہ عمل اسی وقت عبادت ہوگا کہ اس کے بجالانے کے وقت رضائے خدا اور جناب رسالتمآبؐ وائمۂ طاہرین علیہم السّلام کی خوشنودی کے سوا کوئی اپنی غرض اور مقصد نہ رکھتے ہوں۔ اگر کوئی شخص اس طرح اس عمل کو بجالائے گا تو اس کے سبب سے موعودہ ثواب پائے گا۔ مہلکہ گناہوں سے پاک ہوجائے گا کیونکہ ایسی صورت میں اس کے خلوص اور عمل میں کوئی منافات نہیں ہے۔ پورا عمل اطاعتِ باری تعالیٰ کے واسطے ہے۔ پس اس کے ذریعہ ثواب پائے گا اور گناہوں کے شر سے محفوظ رہے گا۔

لیکن جو شخص ذکرِ حسین مالِ دنیا حاصل کرنے کے لیے کرتا ہے اسے مندرجہ ذیل احادیث پر ضرور غور کرنا چاہیے۔

امام جعفر صادق علیہ السّلام سے روایت ہے:

"جو شخص منفعت دنیا کے لیے حدیث یاد کرے اور دوسروں کو سنائے کہ اس کے ذریعہ اُس کے ہاتھوں میں مال آئے تو اس کے

لیے کوئی حصہ (نعمات پروردگار سے) نہ ہوگا۔ اور جس نے حدیث کی تعلیم و تعلّم سے خیرِ آخرت کا قصد کیا تو خداوند عالم اسے خیرِ دنیا و آخرت عطا فرمائے گا۔"

معصومؑ سے روایت ہے:

"جو شخص علومِ آخرت میں سے کسی علم کو اس لیے حاصل کرے کہ اس کے ذریعہ متاعِ دنیا حاصل کرے گا تو وہ جنت کی بو بھی نہ پائے گا۔"

امیر المومنین علیہ السّلام سے روایت ہے کہ جناب رسولِ خداؐ نے فرمایا:

"جس شخص نے اہلِ علم سے علم حاصل کیا اور اس علم کے مطابق عمل کیا اس نے نجات پائی اور جس نے تحصیلِ دنیا کا قصد کیا تو اس علم سے اس کا وہی ہوگا جس کا اس نے قصد کیا اور جسے حاصل کر لیا یعنی آخرت سے اس کا کوئی حصہ اور نصیب نہ ہوگا۔"

کتاب تحف العقول میں روایت ہے کہ مفضل ابن عمر نے اپنے اصحاب سے وصیت کی اور کہا:

"لوگوں کے مال آلِ محمدؐ علیہم السّلام کے ذریعہ نہ کھاؤ کیونکہ میں نے امام جعفر صادق علیہ السّلام سے سنا ہے آپ فرماتے تھے کہ ہمارے بارے میں لوگ تین گروہوں میں متفرق ہوں گے۔ ایک فرقہ ہمیں ہمارے قائم (قائم آلِ محمدؐ) کے انتظار کی وجہ سے دوست رکھے گا تاکہ وہ ہماری دنیا کو پائیں یعنی ہماری محبت سے ان لوگوں کی غرض یہ ہے کہ وہ ہماری سلطنت کے زمانہ میں عیش پرستی اور خوشگوار زندگی بسر کریں گے پس

وہ اپنے آپ کو شیعہ کہلائیں گے اور ہم سے محبت رکھیں گے۔ ہمارے اقوال کو حفظ کریں گے لیکن ہمارے افعال میں کوتاہی کریں گے۔ یعنی ہمارے کردار کی پیروی نہ کریں گے۔ پس جلدی سے خدا ان کو دوزخ کی طرف محشور کرے گا۔ اور ایک فرقہ ہمیں دوست رکھے گا اور ہمارے اقوال کو سنے گا اور ہمارے کردار سے اس لیے کوتاہی نہ کرے گا کہ ہمارے ذریعہ لوگوں کے اموال کھائے پس اللہ تعالیٰ ان کے شکموں کو نار جہنم سے پُر کرے گا اور ان پر بھوک اور پیاس کو مسلط کرے گا اور ایک فرقہ ہمیں دوست رکھے گا اور ہمارے اقوال کو یاد کرے گا اور ہمارے حکم کو مانے گا اور ہمارے افعال کی مخالفت نہ کرے گا یعنی ان کی رفتار و گفتار ہمارے جیسی ہو گی۔ پس یہ لوگ ہم سے ہوں گے اور ہم ان سے (یعنی یہ لوگ ہمارے حقیقی پیروکار اور محب ہوں گے اور ہم ان کے پیشوا اور امام ہوں گے")

اس طرح حدیثِ مفضل ابن عمر کے مطابق امام جعفر صادق علیہ السلام نے محبّت اہل بیت کا دم بھرتے والوں کی تین قسمیں بیان کی ہیں۔

۱۔ وہ لوگ کہ جو ظہور امام کا اس لیے انتظار کر رہے ہیں تا کہ ان کی حکومت میں دنیوی عیش و آرام حاصل کریں (اس گروہ میں وہ تمام افراد بھی آجاتے ہیں کہ جو بہت زور و شور سے استغاثہ امام کرتے ہیں یا تعجیل ظہور کی دعا مانگتے ہیں مگر خود اپنے سماج و معاشرہ کی اصلاح کے لیے کوئی عملی قدم نہیں اٹھا رہے ہیں) اور ان لوگوں کا ٹھکانہ جہنم ہے۔

۲۔ دوسرا گروہ ان افراد کا ہے کہ جو اہل بیت علیہم السلام کے اقوال بھی بیان کرتے ہوں گے، ظاہراً اپنے کو ان کا پیرو بھی ثابت کرتے ہوں گے مگر ان کی غرض وغایت اس طرح لوگوں سے مال حاصل کرنا ہوگا (اس میں آج کے دور میں خمس وزکوٰۃ وصول کرنے والے وہ علماء اور طلب مال میں ذاکری فرمانے والے افراد شامل ہیں کہ جو اہل بیت کے نام پر دنیا حاصل کرنے میں لگے ہیں) اللہ ان کے شکموں کو جہنم کی آگ سے بھر دے گا۔

۳۔ تیسرا گروہ ان افراد کا ہے کہ جو اہل بیت علیہم السّلام کے حقیقی پیرو ہیں کہ جو دین میں مخلص ہیں اور دنیا پر حریص نہیں ہیں۔ یہی لوگ سچے پیروانِ امام ہیں۔ اور جنت میں انشاء اللہ ان کے ساتھ ہوں گے۔

اس طرح اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ذاکری کو طلب دنیا کے لیے اختیار کرنا ایک جانب تو عبادت و عبودیت کے منافی اور شرک کے مترادف ہے تو دوسری جانب اہل بیت علیہم السّلام کے ارشادات کے مطابق جہنمی لوگوں کی صفت ہے اور یہ بھی اسی وقت کہ جب ذاکر کے بیان پر غور نہیں کیا گیا ہے۔ یعنی اگر بیان حق ہو تب بھی۔ لیکن اگر ذاکر کا بیان احترام منبر کے منافی ہے تو پھر تو اور تباہی ہے۔

علماء نے ذاکری کی مثال عبادات میں اذان سے دی ہے۔ آیت اللہ حسین نوری تحریر فرماتے ہیں:

"ذاکر کی مؤذن کے ساتھ مشابہت بہت واضح ہے۔ کیونکہ مؤذن

مومنین کو اس وقت کے حاضر ہونے کی خبر دیتا ہے کہ جس میں مومنین کے لیے چاہیے کہ خداوند تبارک و تعالیٰ کے دربار میں حاضر ہوں اور مؤذن اس بہترین اعمال یعنی نماز کے وقت کے پہنچنے کی اطلاع دیتا ہے جو رستگاری اور اس آتش جہنم کے خاموش کرنے کا سبب ہے جو لوگوں نے اپنے گناہوں کے ذریعہ روشن کی ہے اور اس کے علاوہ نماز کے اور بھی دینی اور اخروی فضائل و مناقب اور خواص ہیں یہاں تک کہ نماز مومن کی معراج ہے اور اسی طرح ذاکر مومنین کو ائمہ معصومین ؑ کے فضائل و مناقب اور مصائب کی خبر دیتا ہے اور ایامِ عزا کے آنے کی اطلاع دیتا ہے کہ جس میں عمل کرنا خداوندِ عالم کے تقرب اور رسولِ خدا و ائمۂ ہدیٰ علیہم السّلام کی خوشنودی، دنیا و آخرت کے شدائد سے نجات اور آتش جہنم کے دریاؤں کے خاموش ہونے کا ذریعہ اور سبب ہے۔ یعنی آلِ محمد علیہم السلام کے مصائب پر رونا۔"

چنانچہ اذان تمام لوگوں پر مستحب ہے مگر کیونکہ ایک جماعت اذان دینے پر آمادہ ہو گئی لہٰذا بقیہ مومنین کو راحت ہو گئی ہے، اسی طرح ذکر حسین ؑ کر کے لوگوں کو رُلانا سب کے لیے مستحب ہے مگر ایک جماعت ذکر حسین ؑ کے لیے آمادہ ہو گئی ہے اور بقیہ مومنین کو راحت ہو گئی ہے۔ مگر جہاں تک ذاکری کی اجرت کا سوال ہے تو اس سلسلہ میں دو باتیں پیش نظر رہنا چاہیے۔

(۱) علمائے اعلام کے درمیان مشہور رہے کہ اذان پر اُجرت لینا حرام ہے اور اس بارے میں بہت سی احادیث وارد ہوئی ہیں۔

علامہ کلینی نے "الکافی" میں اور شیخ طوسی نے "تہذیب" میں امام محمد باقر علیہ السّلام سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ اذان کہنے پر اجرت لینے والے اور مزدوری پر نماز پڑھنے والے کی اقتدار میں نماز نہیں ہوتی اور نہ ہی اس قسم کی اجرت لینے والوں کی شہادت مقبول ہے۔

شیخ صدوق نے کتاب "فقیہہ" میں جناب امیرالمومنین علیہ السّلام سے روایت کی ہے کہ ایک شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی اے امیرالمومنین! خدا کی قسم میں آپ کو خداوند عالم کی خوشنودی کے لیے دوست رکھتا ہوں۔ پس حضرت نے اس سے فرمایا میں تجھے خدا کی خوشنودی کے لیے دشمن رکھتا ہوں۔ عرض کی کیوں؟ فرمایا کہ تو اذان میں اپنے لیے کسب طلب کرتا ہے یعنی تو طلب مال کے لیے اذان کہتا ہے۔

شیخ طوسی نے کتاب "تہذیب" میں جناب امیرالمومنین سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا آخری چیز جس پر میں نے اپنے دل کے حبیب یعنی رسول خدا سے مفارقت کی یہ تھی کہ فرمایا اے علیؑ! جب تم نماز پڑھاؤ تو اپنے پیچھے کھڑے ہونے والے یعنی ماموین میں سے کمزور ترین شخص کی طرح نماز پڑھو اور اس آدمی کو مؤذن نہ بنانا جو اذان کہنے پر اجرت لیتا ہو۔

حضرت علیؑ نے طالبان علم کی اقسام ذکر فرماتے ہوئے کمیل سے فرمایا "ہاں ملا کوئی تو ایسا جو ذہین تو ہے مگر خائن ہے جو آلۂ دین کو طلب دنیا کے لیے استعمال کرنے والا ہے"۔

(۲) حصولِ زر اور نام و نمود کے لیے لوگوں کی خوشنودی حاصل کرنا

دراصل ایمان میں کمزوری کی علامت ہے۔ اگر ذاکرین کو مجلس پڑھنے کا معاوضہ لینا ہی درکار ہے تو اس کی نوعیت ''اجرت'' کی نہ ہو کر ''نیابت'' کی ہونی چاہیے۔ مثال کے طور کسی مجبوری کی بنا پر لوگ اپنی نیابت میں دوسرے کو حج کرنے بھیجتے ہیں۔ اس ''نیابت'' میں بھیجنے میں کچھ رقم بھی دی جاتی ہے مگر یہ اجرت نہیں ہوتی ہے۔ اس میں سفر کے اخراجات کے علاوہ حج پر جانے والے شخص کا اس مدت کا کچھ معاوضہ بھی دیا جاتا ہے تاکہ اس کے سفر پر جانے کے دوران جو اس کی آمدنی میں کمی ہو گئی وہ پوری ہو جائے اور اس کے خاندان پر بوجھ نہ پڑے۔ حضرت علیؑ کا اپنی خلافتِ ظاہری کے دور میں بیت المال سے محض واجبی رقم کا لینا اس طرز عمل کی بہترین مثال ہے۔

ہونا تو یہ چاہیے کہ بانیٔ مجلس ہی ذکر حسینؑ بھی کرے۔ اگر ایسا ہو جائے تو اپنے آپ علوم اہل بیت علیہم السّلام کی نشر و اشاعت ہونے لگے گی اور مجالس کے انعقاد کے لیے مال و زر سے زیادہ علم و معرفت کی اہمیت ہو جائے گی کہ جو ائمہ طاہرین علیہم السّلام کا مقصود تھا۔ لیکن اگر بانیٔ مجلس خود ذکر حسینؑ نہیں کر سکتا تو جس شخص کو مجلس پڑھوائے یہ لحاظ رکھے کہ جس طرح حج کے لیے بھیجتے وقت وہ اپنی نیابت کرنے والے کے کردار و عمل اور علم کا اطمینان حاصل کرتا ہے اسی طرح اس ذاکر کا بھی کر لے۔

دین کا معاملہ بہت سخت ہے۔ ایسا نہ ہو کہ یہاں تو ہم اپنے طور پر نیکی انجام دے رہے ہیں مگر درحقیقت جہنم کی آگ میں اضافہ کر رہے

ہوں ۔ اسی لیے ہم کو ہر قدم پر عقل کو استعمال کرنے کی ضرورت ہے ۔ یعنی دین فہمی کی ضرورت ہے ۔ قرآن و سیرت معصومینؑ کی روشنی میں راہِ عمل معین کرنے کی ضرورت ہے ۔

ہماری اللہ تبارک و تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا ہے کہ وہ ہم سب کی توفیقات میں اضافہ کرے کہ ہم سب صراطِ مستقیم پر گامزن رہتے ہوئے اس کے دین کی سربلندی کے لیے جد و جہد کریں ۔ آمین ۔

پیشہ اور خلوص

ہر انسان کو غذا کی ضرورت ہوتی ہے۔ بھوک مٹانے کے علاوہ اس کو اور اپنے خاندان کی دیگر ضروریات کے لیے بھی پیسہ چاہیے ہوتا ہے۔ اس کے لیے اُسے کام کرنا پڑتا ہے۔ یہ کام کوئی نوکری، پیشہ یا تجارت ہو سکتا ہے۔

ملازمت، پیشہ یا تجارت اختیار کرنے کے بھی دو طریقے ہوتے ہیں۔ ایک طریقہ نیک نیتی اور خلوص پر مبنی ہوتا ہے یعنی جس میں ایمانداری کو اپنایا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی شخص ڈاکٹر ہے اور اپنے پیشہ میں مخلص ہے تو وہ اپنے مریضوں کا ہمدرد ہوگا اور چاہے گا کہ میرا مریض آسان اور سستے علاج کے ذریعہ جلد ٹھیک ہو جائے۔ اس کے برخلاف ایک بے ایمان ڈاکٹر ہوتا ہے کہ جسے مریض کی صحت سے زیادہ مریض کی جیب کی فکر ہوتی ہے۔ کیسے زیادہ سے زیادہ لمبی رقم اینٹھی جائے۔ اگر مرض کی صحیح تشخیص نہیں کر پا رہا ہے یا صحیح علاج نہیں بھی جانتا ہے تب بھی فیس وصول رہا ہے اور الٹی سیدھی دوا دینے میں لگا ہوا ہے۔

یہ دونوں انداز آپ کو ہر لائن میں ملیں گے۔ چاہے وکالت ہو، تجارت ہو، ملازمت ہو یا کوئی اور کام ہو۔ ملازمت میں بھی آپ کو فرض شناس اور

یہ مضمون پیام نو مورخہ ۱۳ر دسمبر ۱۹۹۱ء کی اشاعت میں شائع ہو چکا ہے۔

ایمان دار ملازم ملیں گے تو بے ایمان اور کام چور افراد کی کمی نہیں ہے۔
تجارت کا بھی یہی حال ہے۔ کہیں کوئی تاجر ایماندار وسچا ملے گا، دام بھی صحیح لے گا، مال ٹھیک دے گا۔ اس کے برخلاف مال میں کھوٹ اور دام میں ہیرا پھیری کرنے والے بھی آپ کو ملیں گے۔

ایمان کا تقاضہ ہے کہ مومن مخلص ہو، جھوٹا نہ ہو، اپنے فرائض کو نیک نیتی کے ساتھ ادا کرے۔

کسی کتاب میں میں نے پڑھا تھا کہ اسلام کی اشاعت اور تبلیغ میں دو بڑے گروہوں کا بڑا ہاتھ ہے۔ ایک گروہ ان اولیاء اللہ کا ہے کہ جنھوں نے کفر و شرک کی تاریکیوں میں لپٹی ہوئی آبادیوں اور بستیوں میں تن تنہا جا کر اپنے اخلاق، کردار اور محبت سے ایمان کی ایسی جوت جگائی کہ وہاں کے لوگوں نے کلمۂ اسلام پڑھ لیا۔ اور دوسرا گروہ ان مسلمان تاجروں کا ہے کہ جنھوں نے اپنی ایمان داری اور راست بازی کے ذریعہ غیر مسلموں کو اپنے اخلاق و کردار کا گرویدہ بنا کر حلقہ بگوش اسلام کر لیا۔

اگر کوئی مسلمان تاجر آپ کو بے ایمانی کرتا ملے، خراب مال دھوکے سے اونچے داموں میں بیچتا ملے تو آپ سمجھ لیں کہ اس کے ایمان میں کھوٹ ہے۔
یہی حال ان افراد کا بھی ہے جو ناجائز دھندوں اور حرام مال کی تجارت میں لگے ہیں۔

احادیث میں دین کے ذریعہ دنیا کمانے کی مذمت آپ کو شدت سے ساتھ ملے گی جس میں کی کچھ احادیث گذشتہ مضمون "ذاکری کی اُجرت" کے

ذیل میں آپ کی نظر سے گذری ہوں گی۔ علم دین کو طلب دنیا کے لیے استعمال کرنا خلاف عدل ہے۔ احتیاط کا تقاضہ تو یہ ہے کہ اپنی علمی یا دینی حیثیت کو بھی کسی سامان کی خریداری میں دام کم کرانے کے لیے استعمال نہ کرے۔

امام محمد باقرؑ سے روایت ہے کہ ایک دن حضرت علی علیہ السلام بزازوں کی دوکان پر تشریف لے گئے اور ایک دوکان دار سے فرمایا مجھے جامۂ یمن دے۔ اس دوکان دار نے کہا "اے امیر المومنینؑ! جس چیز کی آپ کو ضرورت ہے وہ میرے پاس ہے"۔ جب امیر المومنینؑ نے دیکھا کہ وہ دوکان دار انھیں پہچانتا ہے تو آپ اُسے چھوڑ کر دوسری دوکان پر تشریف لے گئے۔ روایت میں ہے کہ آپ نے دو دو کانیں چھوڑیں کیونکہ دونوں کے مالک آپ کو پہچانتے تھے اور تیسری پر بچہ بیٹھا تھا، تشریف لے گئے۔ اس بچے نے حضرت کو مخاطب کرتے ہوئے "اے شیخ" کہا۔ پس آپؑ نے اس سے کپڑے خریدے اور واپس تشریف لائے۔ جب اس لڑکے کا باپ یا آقا دوکان پر آیا تو اُسے پتہ چلا کہ خریدار امیر المومنینؑ تھے اور اس لڑکے نے نفع زیادہ لیا ہے۔ پس اس نے اتنے پیسے لیے اور حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا اور عذر پیش کیا۔ حضرت نے وہ پیسے نہ لیے اور فرمایا بیع و شراء کا معاملہ دونوں کی رضامندی پر تھا اور وہ گزر گیا

جو امام اتنی احتیاط برتے بھلا وہ ان افراد سے کیونکر راضی ہو سکتا ہے کہ جنھوں نے عبادت کو پیشہ بنا لیا ہے یعنی جو ذکرِ حسینؑ کو طلبِ دنیا کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔ پھر جو افسوسناک صورت حال ہے وہ یہ

کہ ذاکرین کی اکثریت کام چور اور بے ایمان ہے۔ یعنی بغیر مطالعہ اور غور و فکر کے جھوٹی اور سُنی سُنائی باتوں کو بیان کر کے لوگوں کا ایمان خراب کر رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے کسی کے نزدیک ذاکری کی اُجرت حلال ہو مگر یہ تو وہ بھی مانے گا کہ ذاکری کو پیشہ بنانے والا کم از کم اپنے پیشہ میں تو دیانت دار اور مخلص ہو۔ یعنی کتابوں کا مطالعہ کرے۔ قرآن میں غور و فکر کرے۔ تاریخ و حدیث و سیرت کی معلومات حاصل کرے تب ذاکری کی اُجرت لے۔ آپ حضرات کے علم میں ہوگا کہ جب پیام نو میں اس روایت کے بارے میں سوال کیا گیا تھا جس کے مطابق حضرت علیؑ گھوڑے پر بیٹھتے وقت دور کابوں کے درمیان ختم قرآن کر لیتے تھے تو یہاں کے ذاکرین نے کتنی مخالفت کی تھی۔ آج تقریباً پانچ سال ہو چکے ہیں مگر کسی بھی حدیث کی کتاب کو یہ حضرات پیش نہیں کر سکے جوان مخالفت کرنے والے ذاکرین کے اخلاص و نیت پر ایک بڑا سوالیہ نشان ہے۔

شیعہ وفد؟

شیعہ افراد کا تقریباً ۲۵ رکنی وفد اتر پردیش کے بھاجپائی وزیر اعلیٰ شری کلیان سنگھ سے ملا تھا جس پر لوگوں نے مختلف رد عمل کا اظہار کیا اس سلسلے میں میرا ایک بیان قومی آواز مورخہ ۸ ر دسمبر ۱۹۹۱ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد ۱۲ ر دسمبر کے اخبار قومی آواز میں جناب حسن لکھنوی صاحب کا مراسلہ شائع ہوا۔ جناب حسن لکھنوی صاحب کے مراسلہ کے جواب میں میرا مراسلہ "وفد کا معاملہ" کے عنوان سے شائع ہوا۔ کیونکہ اس میں قرآن و حدیث کی روشنی میں مسئلہ پر غور کیا گیا ہے لہٰذا قارئین پیام نو کی خدمت میں اسے پیش کیا جا رہا ہے۔

وفد کا معاملہ

مکرمی! آپ کے موقر روزنامہ مورخہ ۱۲ ر دسمبر میں جناب حسن لکھنوی صاحب کا مراسلہ "شیعہ فرقہ کا وفد" عنوان کے تحت شائع ہوا ہے۔ اس سے قبل بھی اسی موضوع پر چند مراسلات شائع ہوئے ہیں اور کسی نہ کسی عنوان سے میرا نام بھی لیا گیا ہے۔

یہ مضمون پیام نو مورخہ ۲۰ ر دسمبر ۱۹۹۱ء کی اشاعت میں شائع ہو چکا ہے۔

وفد کے ارکان کے بموجب یہ وفد عزاداری کے مسئلہ پر وزیراعلیٰ سے ملنے گیا تھا اور سرکاری اعلان کے مطابق وفد نے بابری مسجد کے مسئلے پر گفتگو کی، اور وزیراعلیٰ کے بیان کے مطابق شیعہ دانشوروں نے بابری مسجد کی جگہ رام مندر بنائے جانے پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ وزیراعلیٰ کے بیان کی تردید ابھی تک ارکان وفد کی جانب سے نہیں کی گئی۔

جناب حسن لکھنوی صاحب نے کیونکہ اپنے مراسلہ میں قرآن وحدیث کی روشنی میں مسئلہ کا حل طلب کیا ہے لہٰذا میں ان کی توجہ سورۂ نساء کی ۶۰ ویں آیت کی جانب مبذول کرانا چاہوں گا۔ جس میں ارشاد ہوا:

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ ؕ وَيُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا ○

یعنی "(اے رسولؐ) کیا تم نے ان لوگوں کی جانب غور کیا کہ جو یہ گمان کرتے ہیں کہ وہ اس پر ایمان لائے ہیں کہ جو تم پر نازل کیا گیا ہے اور جو تم سے پہلے نازل کیا گیا ہے حالانکہ یہ اس بات کے خواہش مند ہیں کہ اپنا فیصلہ طاغوت سے کروائیں اور جب کہ انھیں (اُلٹے) طاغوت کا انکار کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اور شیطان چاہتا ہے کہ ایسے لوگوں کو راہ حق سے بہت دور بھٹکا دے۔"

اس طرح اس آیۂ کریمہ میں طاغوت کے ذریعہ فیصلہ کروانے کو منافیٔ ایمان اور بہت زیادہ گمراہی کی علامت بتایا گیا ہے۔

جو احادیث ہم تک پہنچی ہیں ان میں جائز حق بھی حاکم جابر سے طلب کرنے کی ممانعت ملتی ہے۔ حضرت علی ابن موسیٰ رضاؑ کے ایک دوست صفوان نے کہ جو اونٹوں کو کرایہ پر دیا کرتے تھے، حاکم وقت کو حج کے لیے اونٹ کرایہ پر دینے کا معاہدہ کیا۔ جب صفوان نے حضرت علی ابن موسیٰ رضاؑ سے اپنے اس معاہدہ کی بابت سوال کیا تو حضرت علی ابن موسیٰ رضاؑ نے جواب دیا کہ تم اسی حاکم جابر کے ساتھ جہنم میں ڈالے جاؤ گے۔ صفوان نے وجہ پوچھی تو انھوں نے جواب دیا کہ جب تم اونٹ کرایہ پر دو گے تو چاہو گے کہ تمھیں کرایہ پورا مل جائے لہٰذا تم یہ چاہو گے کہ وہ بخیر و عافیت حج کر کے آجائے اور جب تک تمھاری رقم ادا نہ کر دے حکومت پر برقرار رہے، اور جابر حاکم کے اقتدار کی تمنا کرنا ہی کفر ہے۔

اب آپ اس "شیعہ وفد" کی وزیر اعلیٰ کلیان سنگھ سے ملاقات کو مندرجہ بالا مضمون کی روشنی میں پرکھیں۔ اگر بفرض کلیان سنگھ صاحب یہ وعدہ کر لیتے ہیں کہ وہ ماہِ رمضان میں شیعوں کے جلوس اٹھوا دیں گے تو اس وقت تک شیعوں کے لیے یہ فطری ہو گا کہ کلیان سنگھ صاحب کی سلامتی اور اقتدار کے خواہاں رہیں کہ جو درست نہ ہو گا۔

ہمارے نزدیک ایک ایسے فرد سے جو مسجد کے انہدام کی بات کر رہا ہے جلوس ہائے عزا کی بابت گفتگو کرنا خلاف شریعت عمل ہونے کے ساتھ قطعی احمقانہ فعل بھی ہے۔ پھر بابری مسجد کے مسئلہ پر تو ان حضرات کو اور بھی محتاط رویہ اختیار کرنا چاہیے تھا۔

ہم طاغوت سے بھیک مانگنے کے قطعی قائل نہیں ہیں، اور نہ ہی بھیک مانگنے سے حق ملتا ہے۔ جو حضرات کہ وزیر اعلیٰ سے ملنے گئے تھے اگر آج چودہ برس کے بعد اللہ نے ان کو اس بات کی توفیق عطا کی ہے کہ وہ جلوس ہائے عزا کی بحالی کے لیے کوئی سنجیدہ کوشش کریں تو ان حضرات کو قربانیوں کے لیے آمادہ ہونا پڑے گا۔ ایام عزا آتے ہی لکھنؤ سے غائب ہو جانے کی اپنی روش کو چھوڑ کر یہیں خدمت عزا کے لیے تیار ہونا ہوگا۔ جس ذہنیت نے اچھے بُرے اور اپنے پرائے کی سمجھ ختم کر دی ہے اس کو سدھارنا ہوگا اعتماد کی فضا کو بحال کرنا ہوگا۔ اپنی صفوں میں گھسے ہوئے مخبروں اور دلالوں کو پہچاننا اور ان سے کنارہ کشی اختیار کرنا ہوگی۔ اور اس بات کو پیش نظر رکھنا ہوگا کہ جلوس ہو، مجلس ہو، محفل و میلاد ہو، اگر ان کے ذریعہ سے مسلمانوں میں اتحاد، یگانگت اور خیر سگالی کے جذبہ میں اضافہ ہو تو یہ عین عبادت ہوں گے لیکن اگر ان سے دوسرے فرقہ والوں کو چڑھانا یا نفرت کی دیواریں کھڑی کرنا مقصود ہوا تو یہ گناہ کبیرہ قرار پائیں گے۔

والسّلام

جاوید مرتضیٰ

صدر علی کانگریس، ۲-۵۱ عارف آشیانہ مقابل لوہیا پارک
چوک۔ لکھنؤ-۳

جاوید مرتضیٰ صاحب کی تصنیفات

۱۔ دین فہمی

۲۔ صراط مستقیم (مجموعہ تقاریر)

۳۔ دین کا بنیادی تصور، تقلید اور اتباع

۴۔ حیات محمدؐ، ایک مختصر تعارف

۵۔ سفر آخرت

۶۔ بابری مسجد کی شہادت کے بعد

۷۔ بی۔ جے۔ پی۔ صدر کے نام کھلا خط

۸۔ رام اور اسلام (ہندی)

۹۔ فکر و فہم

۱۰۔ خُطبۂ عید الفطر

فہرست مضامین

فکر و فہم
از:
جاوید مرتضیٰ
المرتضیٰ پبلی کیشنز

فکر و فہم

فکر انسانی ذہن کی اس صلاحیت کا نام ہے جس کے ذریعہ وہ اپنے علم و مشاہدہ کو مربوط کر کے کسی نتیجہ تک پہنچنے کی جستجو کرتا ہے۔

ہمارا دین اسلام انسان کی فکر کو بیدار کرنے، اس کو صحیح سمت عطا کرنے کی جانب خصوصی توجہ دیتا ہے اور ہونا بھی چاہئے کیونکہ عمل کا دارومدار فکر پر ہوتا ہے۔ اگر سوچنے کا طریقہ درست نہیں ہوگا تو پھر عمل بھی درست نہ ہوگا۔ اگر عمل کی مثال کسی عمارت سے دیں تو فکر کی مثال اس عمارت کی نیو بنیاد کی ہوگی۔ جتنی بلند اور عالیشان عمارت تعمیر کرنا ہوگی اسی مناسبت سے اس کی بنیاد کو پختہ اور مضبوط بنانا ہوگا۔

فکر و فہم ان تحریروں کا مجموعہ ہے جو ہفت روزہ اخبار پیام نو میں نومبر ۱۹۸۹ء سے دسمبر ۱۹۹۱ء کے درمیان شائع ہوئیں۔ یہ تحریریں اپنے مضامین کی وسعت و گہرائی کے باعث فکری بیداری کے اہم عامل کی حیثیت سے ہمیشہ کارگر ثابت ہونے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔

فکری بیداری لانے کی اسی افادیت کے پیش نظر ہم اس مجموعہ کو پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔

المرتضیٰ پبلی کیشنز

۲-۵۰۱، عارف آشیانہ، مقابل لوھیا پارک، چوک، لکھنؤ

AL-MURTAZA PUBLICATIONS

501-2, Arif Ashiana, Opp. Lohia Park, Chowk, Lucknow-226 003

E-mail: jawedmurtaza@yahoo.co.in

نام کتاب : فکر و فہم

مصنف : جاوید مرتضیٰ

ای۔میل : jawedmurtaza@yahoo.co.in

تعداد :

ناشر : المرتضیٰ پبلی کیشنز، ۲۔۵۰۱، عارف آشیانہ، چوک، لکھنؤ۔۳

سن اشاعت : ۲۰۰۸ء

سرورق : ثمینہ جاوید

مطبوعہ : یونٹی پرنٹ سرویز

قیمت : Rs. 100/-

Al-Murtaza Publications

501-2, Arif Ashiana, Opp. Lohia Park,

Chowk, Lucknow-226 003

E-mail: jawed murtaza@yahoo.co.in

پیش لفظ

زیر نظر کتاب ان مختصر مضامین کا مجموعہ ہے جو ہفت روزہ پیام نو، لکھنؤ میں شائع کیئے گئے۔ ان تحریروں کا مقصد ان لوگوں کی فکروں کو متوجہ کرنا تھا کہ جو اپنی مصروفیت کے باعث یا دینی کتب کی عدم فراہمی کی وجہ سے خود مطالعہ نہیں کر پا رہے ہیں۔ یہ تحریریں ۱۹۸۹ء سے ۱۹۹۱ء کے درمیان لکھی گئیں لیکن موضوع آج بھی اتنا ہی تازہ ہے جیسا کہ اوّلین اشاعت کے وقت تھا۔

زیر نظر مضامین قرآن کریم، مستند احادیث اور حقیقی علمائے دین کی تحریروں کی روشنی میں لکھے گئے ہیں اور آج تک کسی عالم دین نے ان تحریروں سے عدم اتفاق نہیں ظاہر کیا ہے بلکہ ہندوستان اور بیرون ہند علمی حلقوں میں ان مضامین کو کافی سراہا گیا ہے۔

ہم قارئین کرام سے گذارش کرتے ہیں کہ وہ بھی اپنے خیالات سے ہمیں آگاہ فرمائیں۔

جاوید مرتضیٰ

501-2, Arif Ashiana,
Opp. Dr. Lohia Park, Chowk,
Lucknow-226 003
E-mail: jawedmurtaza@yahoo.co.in
Website: deenfahmi.org
Phone: 9415544115

از:

جاوید مرتضیٰ

ناشر:

المرتضیٰ پبلی کیشنز

۲-۵۰۱ عارف آشیانہ، مقابل لوہیا پارک، چوک لکھنؤ-۳

۱

کُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ

سورۂ توبہ کی ۱۱۹ویں آیت میں ارشاد رب العزت ہو رہا ہے:

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَکُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ ۞ "اے ایمان والو! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو (یعنی اللہ کی نافرمانی سے بچو) اور سچوں کے ساتھ ہو جاؤ۔"

یہ آیۂ کریمہ درحقیقت وہ نسخہ ہے کہ جس کو اگر استعمال کیا جائے تو انشاء اللہ اپنے معاشرہ میں رائج زیادہ تر برائیوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔

اس آیۂ کریمہ میں دو باتوں کا حکم دیا گیا ہے

۱۔ اللہ کی نافرمانی سے بچو ——— اور

۲۔ سچوں کے ساتھ ہو جاؤ۔

یہ دونوں احکام باہم مربوط ہیں یعنی سچوں کا ساتھ حاصل کرنے کے لیے پہلے تقویٰ اختیار کرنا پڑے گا۔ اللہ کے احکام کی تعمیل کرنی ہوگی۔ اس کی نافرمانی سے بچنا ہوگا۔

بعض مفسرین نے اس آیۂ کریمہ کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "صادقین" سے مراد حضرات اہل بیتؑ ہیں تو اب اہل بیتؑ

یہ مضمون پیام نو مورخہ ۱۰، ۱۷، اور ۲۴ نومبر ۱۹۸۹ء کی اشاعتوں میں شائع کیا جا چکا ہے۔

کا ساتھی بننے کے لیے تقویٰ اختیار کرنا لازمی ہے اور ان سچوں کا ساتھ تب ہی نصیب ہوگا کہ جب انسان خود سچائی اختیار کرے۔ جھوٹ، بہتان، بدی، غیبت، تہمت تراشی، گالم گلوج، ریاکاری، خود پسندی اور اللہ کی نافرمانی کے ساتھ کوئی شخص اگر یہ تصور کرے کہ وہ اہلِ بیتؑ کا ساتھی بن جائے گا تو اس سے زیادہ جاہل اور بے وقوف کون ہوگا؟ ایسا شخص شیطان کے دامِ فریب میں مبتلا ہوتا ہے۔ خود بھی گمراہ ہوتا ہے اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتا ہے۔

قرآن کریم جو معیار ہمارے سامنے پیش کرتا ہے اس کے معنی صرف زبان سے سچ کہنا کافی نہیں ہے بلکہ کہنے والے کی نیت اور ارادہ بھی سچا ہونا چاہیے اگر کوئی شخص زبان سے سچ بات کہے مگر اس کی نیت اور ارادے میں کھوٹ ہو تو قرآن اس کو جھوٹا قرار دیتا ہے۔ سورۂ منافقون کی پہلی آیت پر آپ غور فرمائیں۔ ارشاد ہو رہا ہے:

اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ ۘ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ ؕ وَ اللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ ۝

"(اے رسول) جب تمہارے پاس منافقین آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ یقیناً اللہ کے رسول ہیں حالانکہ اللہ جانتا ہے کہ بے شک تم اس کے رسول ہو مگر اللہ گواہی دیتا ہے کہ یقیناً یہ منافقین جھوٹے ہیں۔"

اس آیۂ کریمہ میں منافقین کی حالت بیان کی گئی ہے کہ وہ رسولِ اکرمؐ

کے پاس آتے ہیں تو آپ کی رسالت کی گواہی دیتے ہیں مگر چونکہ ان کا عمل صرف دکھاوے کا ہوتا ہے اور ان کی نیت رسولِ اکرمؐ کی پیروی کرنا نہیں ہوتا بلکہ محض زبانی جمع خرچ کرنا ہوتا ہے تو قرآن اُن کو جھوٹا قرار دیتا ہے بھلے ہی وہ لوگ زبانی طور پر رسول اکرمؐ کو خوش کرنے ہی میں لگے ہوں۔

سورۂ بقرہ کی آیت ۲۰۴ میں ارشاد ہوا

وَمِنَ النَّاسِ مَن يُّعۡجِبُكَ قَوۡلُهٗ فِى الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا وَيُشۡهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِىۡ قَلۡبِهٖ ۙ وَهُوَ اَلَدُّ الۡخِصَامِ ۝ "(اے رسول) لوگوں میں کچھ ایسے بھی ہیں جن کی دنیوی زندگی کے بارے میں باتیں تمھیں بھلی معلوم ہوتی ہیں اور جو اُن کے دلوں میں چھپا ہوا ہے اس پر اللہ کو گواہ ٹھہراتے جاتے ہیں (یعنی اپنی نیک نیتی ظاہر کرنے کے لیے اللہ کی قسمیں کھاتے جاتے ہیں)، مگر یہی لوگ تمھاری دشمنی میں سب سے زیادہ جھگڑالو ہیں"۔

قرآن کریم کی متعدد آیات کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ پیروی کی نیت کے بغیر محض زبانی رسول اکرمؐ کی رسالت کی گواہی بھی نفاق اور دشمنی کی علامت ہے۔

اب ہم رسول و آل رسول علیہم السلام کی کتنی پیروی کر رہے ہیں اور ان کی تعلیمات کی کتنی واقفیت رکھتے ہیں اس کو واضح کرنے کیلیے